ہجر کی رات کا ستارا

ناصر کاظمی کی شخصیت اور شاعری پر مضامین

مرتبہ

احمد مشتاق

نیا ادارہ

ہجر کی رات کا ستارا

ہجر کی رات کا ستارا

مرتبہ

احمد مشتاق

نیا ادارہ

۱۵ - سرکلر روڈ

لاھور

پاکستان

بارِ اول : جنوری ، ۱۹۷۶ء

ناشر : مشتاق احمد چودھری
۱۵ - سرکلر روڈ ، لاہور

مطبع : سویرا آرٹ پریس
۱۵ - سرکلر روڈ ، لاہور

ترتیب

پیش لفظ

ہمارے یہاں شاعروں اور ادیبوں کو یاد کرنے کا ایک ہی طریقہ چلا آتا ہے کہ سال کے سال اُن کی یاد میں ایک جلسہ کر دیا جائے۔ اس لیے شاید ناصر کاظمی کے سلسلے میں یہ یادگاری مجموعہ آپ کو ایک بدعت نظر آئے۔ مگر شاعر کی یاد میں سال کے سال جلسہ کرنا کوئی ایسا سنجیدہ عمل نہیں بلکہ ایک بے لذت رسم ہے۔ اس بے لذت رسم میں ناصر کاظمی کو دفنا دینا کم از کم مجھے تو گوارا نہیں تھا۔ زیرِ نظر مجموعہ اس رسم سے ہٹ کر شاعر کو یاد رکھنے کی ایک کوشش ہے۔

اب ناصر کاظمی کی شخصیت اور شاعری پر مشتمل مضامین کا یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کی ترتیب و اشاعت میں تاخیر واقع ہوئی۔

اس مجموعے میں ناصر کاظمی کے بعض بہت قریبی دوستوں کے مضامین نہ دیکھ کر آپ حیران تو ہوں گے۔ مجھے خود بھی اُن کی غیر موجودگی کا قلق ہے لیکن مجبوریاں سب کے ساتھ لگی ہیں۔ ظاہر ہے اُن کی بھی کچھ مجبوریاں ہوں گی۔ مثلاً محبوب خزاں سے اس سلسلے میں سب سے پہلے درخواست کی گئی تھی۔ انھوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ جب یاد دہانی کرائی گئی تو اُن دنوں وہ یورپ کے سفر پر جا رہے تھے۔ کہا کہ یورپ کے کسی شہر میں بیٹھ کر لکھوں گا مگر شاید وہاں کی فضا بھی اس کام کے لیے سازگار ثابت نہ ہو سکی۔ شیخ صلاح الدین نے بھی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا اور شیخ صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بات کے پکّے آدمی ہیں۔ اُنھوں نے مضمون لکھا مگر مجھے اس لیے نہیں دیا کہ میں نے انھیں یہ نہیں کہا تھا کہ مضمون مجھے اپنے مجموعے کے لیے چاہیے۔ یوں بھی اُن کا ناصر کاظمی ہمارے آپ کے ناصر کاظمی سے بہت مختلف ہے۔ یہ ننھا سا مجموعہ

شاید اس کا متحمل بھی نہ ہو سکتا ۔ غالب احمد کو بھی اس مجموعے کے لیے لکھنا تھا ۔ کافی دیر کے بعد I and Thou کے موضوع پر ایک مضمون انھوں نے لکھا بھی لیکن وہ "پہلی بارش" کا دیباچہ بن گیا ۔ رہ گئے حنیف رامے تو وہ اب میدانِ سیاست کے شہسوار ہیں ، مصوری اور ادب اُن کا کیا بگاڑ سکتے ہیں ۔ یوں تو اور لوگوں نے بھی ناصر پر بہت کچھ لکھ رکھا ہے لیکن میں انھیں اس مجموعے میں شامل کرنے سے معذور رہا ، اسے آپ میری مجبوری سمجھ لیں ۔ "پہلی بارش" کی غزلوں پر محمد سلیم الرحمٰن سے بطورِ خاص مضمون لکھوایا گیا تھا جو غالب احمد نے مجھ سے پڑھنے کے لیے لیا اور پھر وہ مضمون اُن سے گم ہو گیا اور محمد سلیم الرحمٰن مجھ سے ناراض ہو گئے ۔ میں اس کوتاہی کے لیے اُن سے معذرت خواہ ہوں ۔

اب کچھ باتیں اس مجموعے میں شامل مضامین کے بارے میں ۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مجموعہ کسی ایک مکتبۂ فکر کے لکھنے والوں یا دوستوں کے کسی ایک حلقے کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ اس میں تمام مکاتیبِ فکر کے ادیبوں کے مضامین شامل ہیں ۔ ان میں ترقی پسند بھی ہیں اور غیر ترقی پسند بھی اور ایسے بھی ہیں جو اپنی ذات کے ساتھ کوئی لاحقہ پسند نہیں کرتے ۔ مطلب یہ ہے کہ ناصر کی شخصیت اور شاعری کی کوئی ایک پسندیدہ تعبیر پیش کرنا مقصود نہیں ۔ اس رنگا رنگ شخصیت اور تہ دار شاعری کو اس عہد نے اپنے نقطہ ہائے نظر کے ساتھ جس جس طرح دیکھا اور پرکھا ہے اس کا امکانی حد تک احاطہ ہو جائے ۔ مضامین پوری آزادی اور دیانت داری سے لکھے گئے ہیں ۔ کیونکہ میں اس مجموعے کو ایک ایسی دستاویز بنانا چاہتا تھا جس میں ناصر کاظمی کی شخصیت اور شاعری کا بے لاگ تجزیہ کیا گیا ہو اور جو ایک سنجیدہ ادبی اہمیت کی حامل ہو ۔ محض تعریفی یا تقریظی تحریروں سے ناصر کاظمی کو شاید کوئی فائدہ بھی نہ پہنچتا ——

دوسری خاص بات اس مجموعے کی یہ ہے کہ ایک دو مضامین کو چھوڑ کر اس مجموعے میں شامل باقی سب مضامین غیر مطبوعہ ہیں ۔ میری درخواست پر لکھے گئے اور اب پہلی بار شائع ہو رہے ہیں ۔

میں اپنے تمام بزرگوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری درخواست کو قابلِ اعتنا سمجھا اور اپنا قیمتی وقت صرف کرکے مضامین لکھے - میں پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن والوں کا بھی ممنون ہوں کہ جن کے تعاون کے بغیر ناصر کاظمی کے آخری انٹرویو کا شامل ہونا ممکن نہ ہوتا ---

آخر میں مجھے اپنے دوست صلاح الدین محمود کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ جن کی محبت اور ذاتی توجہ ہر مرحلے پر میرے شاملِ حال رہی -

احمد مشتاق

بم ، کبوتر اور شاعری

محترمہ صغرا بی بی*

آٹھ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ناصر رضا انبالے میں پیدا ہوا - اپنی ماں کا پہلا بچّہ اور نانا دادا کے گھر کا چراغ تھا - میں اُس وقت لاہور لیڈی میکلیگن سکول میں برائے تعلیم داخل تھی - چونکہ میں نے فروری میں پرائیویٹ مڈل کا امتحان دینا تھا ، اور جون میں جے - وی کا ، اس لیے میں صرف دو روز یعنی ہفتہ اتوار چھٹی پر آئی تھی - صرف ناصر کو دیکھنے کی غرض سے - ماشاءاللہ ! بہت فربہ ، ہونہار اور چاق و چوبند پایا - بہت خوشی ہوئی - اُس کے بعد امتحانوں سے فارغ ہو کر جولائی ۱۹۲۶ء کو انبالہ پہنچ گئی - وہیں سکول میں ملازم ہو گئی اور سکول میں ہی اپنے رہنے کا ٹھکانہ بھی کر لیا -

اس وقت ناصر چھ مہینے کا ہوگا - اُس کا گھر ہاشمی محلّے میں تھا اور ہمارا قاضی واڑے میں - تقریباً تین یا اڑھائی فرلانگ کا فاصلہ تھا - صبح ناصر اُٹھتا ، دودھ ، انڈے وغیرہ کا ناشتہ کرتا ، کپڑے وغیرہ بدلوا کر روتا اور نوکر کو اشارہ کرتا کہ چلو - وہ ناصر کو لے کر سیدھا نانا کے گھر آ جاتا - پہلے تو وہ خوب کھیلتا ، کبھی کسی کی گود میں تو کبھی کسی کی ، پھر میرے پاس سکول میں آتا - تمام اُستانیاں اُسے باری باری گود لیتیں - جب میری گود میں آتا تو تھکا تھکا سا ہوتا - میں اُس کو آرام سے گود میں لٹا لیتی - تھوڑی دیر میں فوراً ہی سو جاتا - آٹھ بجے کا سویا ہوا تقریباً چار پانچ بج جانے تک اُٹھنے کا نام نہ لیتا - ناصر کے دادا نوکر کو بھیجتے کہ جاؤ اب شام ہو گئی ، ناصر کو لے آؤ - ناصر کے نانا بار بار آتے اور پوچھتے

---

* اس تحریر کے لیے ہم ناصر کاظمی کی خالہ محترمہ صغرا بی بی کے ممنون ہیں -

ناصر جاگا یا نہیں ؟ آخر میں پانی کبھی اُس کے پاؤں کے تلوؤں کو لگاتی کبھی آنکھوں پر لگاتی - تب کہیں ناصر جاگتا - ادھر اُدھر دیکھتا - اپنی امّی کو ڈھونڈھتا ، پھر نوکر لے کر چلا جاتا - اسی طرح پورے ایک سال کا ہو گیا -

ناصر کی دادی کی بہن تین چار میل کے فاصلے پر راجگڑھ نام کے ایک گاؤں میں رہتی تھیں - وہاں اُن کی لڑکی کی شادی تھی - سو ہم سب شادی میں گئے - وہاں مچھر مکھیاں بہت تھیں - ناصر تمام رات مچھروں کی وجہ سے نہ سوتا - وہاں ناصر کو ایک مچھر نے ٹانگ پر کولھے کے پاس کاٹ لیا جس سے ایک دھپڑ سا ہو گیا - اُس پر بہت دوائیں لگائیں مگر وہ دھپڑ ایک گلٹی کی صورت اختیار کر گیا - پلٹس اور پلستر بھی لگائے مگر نہ وہ پکا نہ پھوٹا - آخر ڈاکٹر قدرت نے جو کہ میرے ماموں تھے مشورہ دیا کہ اس کو فوراً شگاف لگانا چاہیے تاکہ یہ ٹھیک ہو جائے - اُن کی رائے کے مطابق دوسرے ڈاکٹر صاحب گھر پر آئے - اُنھوں نے اُس کو چیرا دیا - اُس وقت ناصر صرف ایک سال ایک ماہ کا تھا - میں نے اُس کو اپنی گود میں لٹا کر چیرا دلوایا - جب پٹی باندھ دی گی تو میں نے اُسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا - ناصر نے بیٹھتے ہی ڈاکٹر صاحب کے منہ پر بڑے زور سے تھپڑ مارا اور گالی دی - ڈاکٹر صاحب نے اُس کو خوب پیار کیا اور بہت ہنسے اور کہا : ”لڑکا تو شیر کا بچہ ہے بہت بہادر اور نڈر ہوگا -“

ناصر کے گھر گراموفون تھا جس کے بہت سے ریکارڈ تھے - جب ریکارڈ بجاتے تو کہتا ”یہ نہیں ، چھوٹی بڑی سوئیاں لگاؤ -“ (چھوٹی بڑی سوئیاں رے جالی کا مورا کاڑھنا) ہم سارے ریکارڈ اُس کے آگے کر دیتے تو وہ وہی ریکارڈ نکال کر دیتا - اسی طرح پھر کہتا ”بھر بھر کے جام ساقیا لگاؤ -“ ہم تمام ریکارڈ اتھل پتھل کر دیتے کہ ہمیں نہیں خبر کہاں ہے - ناصر بالکل وہی ریکارڈ نکال کر دیتا - سب کہتے بھئی یہ پڑھا لکھا پیدا ہوا ہے - کبھی رات کو ضد کرتا تو ہم اُس کو کہانی سناتے - ہمیشہ سے آج تک بچوں کو چڑے چڑیا کی کہانی سناتے آئے ہیں کہ کھچڑی پکائی ، چڑیا نے ساری کھائی - مگر ناصر نے اس کو کہانی نہ مانا بلکہ کہا کہ سب جھوٹ ، چڑیا نے آگ کیسے جلائی ، اُس کے پر نہ جلے - ہنڈیا چولھا کہاں سے لائی ، لکڑی کیسے لائی وغیرہ - اس طرح ہوتے ہوئے بڑا ہوتا گیا -

اُس کو تجربے کرنا ، سائنس کے ذریعے بجلی بنانا ، ہوائی جہاز بنانا وغیرہ کا شوق تھا ۔ ایک دفعہ دو بوتلیں لے کر اُن کے منہ توڑ ڈالے ۔ ایک بوتل میں تیزاب اور دوسری بوتل میں خدا جانے مٹی کا تیل تھا یا پٹرول ۔ تانبے کی تار ایک لکڑی کی گلّی پر لپیٹی اور دوسری گلّی پر لوہے کی تار ۔ دونوں کے سرے پر دیوار میں کوئی چیز گاڑ کر ایک چھوٹا سا بلب لگایا ۔ اس سے بجلی جل گئی ۔ خاصی دو تین گھنٹے تک روشنی ہوتی رہی ۔

ہم نے اُس کو کبھی پڑھتے نہیں دیکھا ۔ سکول جاتا تو حاضری لگواتا اور دیوار پھاند کر ناصر اور اُس کا دوست افتخار بھاگ جاتے ۔ کبھی کسی باغ میں جا کر بیر کے درخت پر چڑھ کر بیر توڑتے تو کبھی امرود کے درخت پر چڑھ کر امرود کھاتے ۔ اگر مالی دیکھ لیتا تو کبھی اُس سے میٹھی باتیں کرتے کبھی کچھ پیسے دے دیتے ۔ اگر وہ زیادہ میل محبت کرتا تو اُسے مارتے اور گالیاں دے کر بھاگ جاتے ۔ جب سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا تو ناصر رضا اول آتے اور اکثر دوست فیل ہو جاتے ۔ محلّے میں سے اکثر دوستوں کی مائیں آ کر لڑتیں کہ ہمارے بچوں کا وقت ضائع کرتا ہے ۔ دراصل اُس کو بچپن سے ہی رات کو جاگنے کی عادت تھی ۔ وہ رات بھر جاگ کر پڑھتا جبکہ دوسرے بچّے تھک کر سو جاتے ۔ وہ بہت ذہین تھا ۔ ماسٹر اُس سے بہت خوش تھے اور اکثر شرارتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ۔ ماسٹر صاحب نے جب کبھی اچانک سوال پوچھنا تو فوراً اُس کا صحیح جواب دینا ۔ اسی طرح مسلم ہائی سکول انبالہ سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ۔ پھر لاہور اسلامیہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آ گیا ۔ یہاں آ کر جو کارنامے شروع کیے وہ یہاں کے سب دوست جانتے ہیں ۔

دیوالی کے دنوں میں کسی مندر میں جا گھستے ۔ وہاں پہلے رام رام کرتے اندر چلے جاتے ، حلوا پرشاد وغیرہ لیتے پھر آتے ہوئے تمام تیل کے دیے توڑ پھوڑ کر بھاگ جاتے ۔ پھولوں کے ہار بھی پہن لیتے ۔ ان ہی دنوں اُنھیں ایک اور شرارت سوجھی ۔ امتحان نزدیک تھے کہ اُنھوں نے دو بم بنائے ایک دوست کی فرمائش پر — اور ایک کو کمشنر کی کوٹھی کے پاس گرایا ۔ یہ شکر ہوا کہ وہ پھٹا نہیں ۔ دوسرا بم سکول کے پاس قبرستان میں پھینکا گیا جو بہت دھماکے سے پھٹا ۔ سارا علاقہ کانپ گیا ۔ اُسی وقت ڈپٹی کمشنر نے شہر میں اشتہار لگوا دیے کہ یہ معلوم کرو کہ یہ بم کس نے بنائے ہیں ۔

جو کوئی اُس کا پتا لگائے گا یا اُس کو پکڑوائے گا دو ہزار روپے انعام پائے گا۔ مگر کسی کو خبر نہ تھی کہ چھپے رستم محلّے میں ہی ہیں۔ اس وقت ہم لوگوں کی جان کے لالے پڑ گئے۔ جس کپڑے میں وہ لپیٹے گئے تھے وہ اور اُن کے بچے ہوئے ٹکڑے زمین میں دبائے۔ آتشیں مادے، ربڑ، سوئیاں وغیرہ چھپا دیں۔ خدا کا شکر کہ بات ٹل گئی۔

انبالہ میں ناصر تعزیہ داری بڑی عقیدت سے کرتا تھا۔ محرم کا چاند نظر آیا اور تعزیہ بنانا شروع کیا۔ میرے سپرد پھول بنانا اور جالی کترنی تھی۔ والدہ لئی پکاتیں اور والد صاحب پاس بیٹھ کر ملاحظہ فرماتے۔ دو تین دوست مل کر بیٹھتے۔ اُس وقت ہنسی اتنی سستی تھی کہ ہر وقت جیسے پانی کے گھڑے لنڈھائے جا رہے ہوں۔ کبھی نوحے پڑھتے کبھی ماتم کرتے۔

پھر کبوتروں کا شوق ہوا۔ میرے بڑے بھائی محمد حسین عرف نتھو بہت کبوتر رکھتے تھے۔ اُن کے لیے مصالحے پکاتے، بادام، پستہ، بالائی، موٹھ کی دال میں ملا کر کبوتروں کو کھلاتے۔ یہ اُن کے پاس جاتا اور کبوتروں سے کھیلتا مگر والد کے ڈر سے گھر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اس کو بہلانے کے لیے کبوتروں میں لے جاتے۔ یہ دیکھتا اور خوش ہوتا۔ جب چھ سات سال کا ہوگیا تو کبوتروں کے نام اور نسلوں وغیرہ کی بابت پوچھتا۔ پھر خود کبوتر رکھنے شروع کر دیے۔ بڑے گھر میں اُس کی ماں اور دادا نے اُس کو کبوتر منگا دیے اور کوٹھے پر کبوتروں کا دربہ بنوا دیا۔ اب اس کو کبوتروں کی خاطر ہاشمی محلّے سے قاضی واڑے جانا پڑتا تھا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں کبوتر چوری ہو جاتے یا اڑ جاتے کیونکہ اُن کے گھر کا پرانا نوکر کبوتر چرا کر بیچ آتا اور کہتا کہ اُڑ گیا یا کہ بلی کھا گئی۔ پھر جب ان کا تبادلہ پشاور ہوا تو کبوتروں کا پیچھا چھٹا۔ کچھ عرصے بعد جب ناصر کے نانا کا انتقال ہوا تو پھر ان کو مسلسل انبالہ ہی میں رہنا پڑا۔ اس لیے کبوتروں کا شوق پھر لوٹ آیا۔ کبوتر مول لاتا کبھی شہر سے کبھی پٹیالہ شہر سے۔ اور باہر سے ہی گھر میں پھینک دیتا۔ پھر دوڑا آتا اور ماں سے کہتا کہ اماں کسی کا کبوتر آ گیا ہے۔ کیسا اچھا ہے اسے ضرور پکڑوں گا۔ آخر پکڑ کر بند کر لیتا۔ اسی طرح کبوتروں کا سلسلہ جاری رہا۔ بہت سارے کبوتر ہو گئے۔

میرا چھوٹا بھائی سرور تعزیہ بناتا تھا جو گلی کے نکڑ پر رکھا جاتا تھا ۔ رات کو سپاہی باقاعدہ اُس پر متعین ہوتے تھے ۔ ناصر بھی اُن میں شرکت کرتا تھا ۔ جب رات کو حلقۂ ماتمی آتا تو یہ چائے وغیرہ کا اہتمام کرتا ۔ جب سرور ملازمت کے سلسلے میں پردیس چلا گیا تو تعزیہ داری ناصر نے سنبھال لی ۔

ابھی بی ۔ اے کی ڈگری نہیں لی تھی کہ پاکستان بن گیا ۔ ناصر گرمیوں کی چھٹیوں میں جب انبالہ گیا تو کہنے لگا کہ ابا جان مکان فروخت کر دیں اور لاہور میں کوٹھی بنوا لیں یا کوئی مکان خرید لیں ۔ کیونکہ بہت لوگ ہندو سکھ مکان فروخت کر کے ہندوستان جا رہے ہیں ۔ خدا جانے کیسا وقت آ جائے اور ہمیں لاہور جانا پڑے ۔ ناصر کے والد یہ سن کر بہت خفا ہوئے اور گالیاں دینے لگے کہ ہم یہیں رہیں گے ۔ اپنے باپ دادا کی قبریں تھوڑا ہی چھوڑ سکتے ہیں ۔ ناصر کہتا "ابا جان آپ یہاں سے ایسے نکلیں گے کہ اپنا حقہ تک نہیں اٹھا سکیں گے ۔" آخر وہی ہوا جو ہونا تھا ۔ ایک دو بستر اور بکسوں کے سوا کچھ نہ لا سکے ۔ جس تکیہ کے غلاف میں نقدی نوٹ سی رکھے تھے وہ بھی اُس وقت راستے میں گم ہو گیا ۔ اُدھر والد صاحب کی پنشن ہو گئی ۔ گھر کا سامان کچھ ساتھ نہ تھا ۔ آخر فین روڈ پر ایک کوٹھی میں قیام کیا ۔ جس میں بہت سامان تھا ۔ فرش ، قالین ، میزیں ، الماریاں ، ستار ، سارنگی ، شطرنجی میزیں ، سنگھار میز ، چینی کے برتن ، ہر طرح کا فرنیچر ۔ ایک دو ماہ اُس گھر میں رہے ۔ پھر ملٹری نے حکم دیا کہ یہ کوٹھی کسی افسر کو الاٹ ہو گئی ہے ، آپ خالی کر دیں ۔ ناصر نے کچھ سامان ، شطرنجی میز ، دو پلنگ ، مسہری اور دو چار برتن لے لیے کہ جب کوئی مکان مل جائے گا استعمال کریں گے ۔ آخر پرانی انارکلی میں ایک مکان اُن کے تایا زاد بھائی نے دلوا دیا ۔ مکان کافی بڑا اور کئی منزلہ تھا ۔ ناصر کی والدہ نے اپنے ماموں کو بلا لیا ۔ اُوپر کی منزل اُنھیں دے دی ۔ اس کے بعد ممانی صاحبہ نے اپنی بیٹیوں کو بلا لیا ۔ ایک منزل میں ماموں جان ، دوسری منزل میں ماموں کی چھوٹی بیٹی اور نیچے ناصر کی والدہ ۔ ایک بیٹھک اور پیچھے کا کمرہ اور باورچی خانہ ماموں کی بڑی بیٹی نے سنبھال لیا ۔ جس طرح ہو سکا ناصر کے والد نے گزارا کیا ۔ کیونکہ سب نازک مزاج اور کھلی ہوا کے رہنے والے تھے

اس واسطے تمام دن ، صبح شام ، سوری میں پانی ڈالتے اور دھوتے کہ بدبو نہ آئے - اُدھر پیسے کی تنگی - اشرفیوں کا ہار توڑا ، ایک ایک کرکے فروخت کیا اور وقت گزارا - ناصر نے نوکری کی جستجو شروع کر دی - سیالکوٹ میں ملازم بھی ہوگیا - مگر اچانک ناصر کے والد بیمار ہو کر ہسپتال داخل ہو گئے - ناصر کو اطلاع دی گئی - ناصر فوراً پہنچا مگر اگلے روز ہی والد صاحب کا انتقال ہوگیا -

اسی دوران ناصر نے اپنا نیا سلسلہ شروع کیا اور "اوراقِ نو" نکالنے کی ٹھانی - پیسہ نہیں تھا اور نہ ہی والد صاحب کی پنشن ملتی تھی - والدہ کے زیورات لے جانا شروع کر دیے - ۱۶ تولے کے سونے کے کڑے ، چمپا کلی ، نتھ اور آرسی وغیرہ - چاندی کے بہت زیور تھے جو فروخت کرکے گھر کا گزارہ بھی کرتے رہے - والدہ نہایت غم زدہ تو تھیں ہی مگر ناصر کی بے روزگاری اور آوارہ گردی دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئیں - تمام دن قرآن شریف اور دعائیں پڑھنا اُن کا شغل ہوگیا - آخر نہ برداشت کر سکیں - دماغ کی رگ پھٹ گئی اور پانچ دن کی علالت کے بعد مر گئیں -

اب ناصر اور انصر بے یارو مددگار رہ گئے - دونوں بھائیوں میں اتفاق بہت تھا - ناصر نے انصر کو آزردہ نہیں ہونے دیا - دسویں جماعت کا امتحان پاس کرتے ہی خالہ کے پاس منٹگمری بھیج دیا - انصر کی توجہ اور کوشش سے ناصر کی شادی ہوگئی - خدا نے حد سے زیادہ رفیق او غم گسار بیوی عطا فرمائی - جس نے دونوں بھائیوں کو ہر طرح سے سکون دیا اور ہر حالت میں اُن کی مرضی کے مطابق رہی - کسی قسم کی شکوہ شکایت سے اُنھیں پریشان نہ کیا - جو کہ اپنے والدین کے ہاں ناز و نعمت سے پلی تھی تنگی بھی سہتی اور ناصر صاحب کی گھر سے بے نیازی بھی - لیکن انصر کے بھروسے پر بچوں پر توجہ مرکوز رکھی - اور کبھی شکایت نہ کی - ہر ایک سے ہنس کر ملی اور خاطر تواضع کی - وہ ناصر کی طبیعت کو سمجھ گئی ، اُس کی بے نیازی کو اپنا لیا اور قوم کی امانت سمجھ کر پروان چڑھاتی رہی - خدا نے دو بچے دیے - اُن پر پوری توجہ دی - اعلیٰ تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی -

اگر کوئی پوچھتا کہ ناصر نے کچھ کام شروع کیا یا ملازمت کی تو ہم کہتے کہ ریڈیو پر جاتا ہے اور شعر کہتا ہے - ہم بھی کبھی کبھار ریڈیو

سن کر خوش ہو جاتے - پھر ہم نے سنا کہ ریڈیو میں ملازم ہو گیا ہے - خدا کا شکر ادا کیا - کیونکہ میں تو خود مجبور تھی اور دور تھی - کبھی سرگودھے سے آتی تو خیریت معلوم کرنے آ جاتی - کبھی گھر ہوتا تو مل جاتا - بڑی گرم جوشی اور محبت سے ملتا - سب کی خیریت پوچھتا - سرگودھے میں پرائیویٹ انجمن فاطمیہ کی طرف سے کھولا ہوا سکول تھا - میں ، برائے چندہ ، سال کے بعد اپنی سیکریٹری اور خزانچن کے ساتھ آتی - شفیقہ انجمن کو چندہ بھی دیتی اور کھانے و چائے وغیرہ سے تواضع بھی کرتی - گھر بسا ہوا دیکھ کر اور بچوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی اور میں اکثر شفیقہ کو کہتی کہ میں تمھاری والدہ کی اور تمھاری بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے بے وسیلہ بچوں کو سنبھال لیا اور گھر آباد کیا - اسی طرح تمھارا خانہ آباد رہے - بچوں کی خوشیاں تمھیں دیکھنی نصیب ہوں -

خدا نے شفیقہ کی کوشش سے انصر کو پروان چڑھا دیا - اللہ نے سب کچھ دے دیا - مگر اس کی خبر نہ تھی کہ ناصر اس قدر شہرت حاصل کرے گا - مگر موت شاعر کی شہرت کو مکمل ہونے سے پہلے ہی آ دبوچے گی اور دوست و احباب کو روتا سسکتا چھوڑ جائے گی - گو میں ناصر سے دور رہتی تھی مگر ناصر کی محبت میرے دل کی گہرائیوں میں ہر وقت جاگزیں تھی - جب دل زیادہ بے قرار ہوتا تو اچھرے سے آ جاتی - ناصر کو دیکھ کر تسلی ہو جاتی مگر اس کی شکل اور اس کی بیماری کی حالت دیکھ کر دل میں ہر وقت خدشہ ہی رہتا تھا کہ خدا ہمت دے - سخت کمزور ہوتا جا رہا تھا - آخر وہ دن بھی آ گیا جب سات محرم ۱۹۷۱ء کو خون کی الٹی آئی اور میو ہسپتال داخل ہو گیا - یہ موت کا پہلا مرحلہ تھا - تین ماہ ہسپتال میں رہ کر کچھ تھوڑی زندگی کی امید لے کر گھر آ گیا مگر موت تو بھوکی چیل کی طرح منڈلا رہی تھی - پھر دوبارہ حملہ ہوا - رمضان شریف ہسپتال میں گزارہ - مگر موت تو نہیں بھولی تھی - تیسرا حملہ جنوری میں ہوا اور پھر ہسپتال داخل ہوا جو کہ موت کا مرکز بنا - آخر ۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو مر گیا -

* * *

وہ اک نہال تھا جو آگا اور جل گیا

عبدالمجید

ناصر کاظمی پر کچھ بھی لکھنا میرے لیے آسان نہیں - سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ کسی نام ور شاعر کا موازنہ کرنے کے لیے جو عبور شعراء کے کلام پر ہونا چاہیے وہ مجھ میں نہیں ہے - بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ میں نے شعر میں بحیثیت شعر کے دلچسپی بہت بعد میں محسوس کی ہے - اس میں میں اپنے تین دوستوں سے متاثر ہوا ہوں اور اب وہ تینوں خدا کو پیارے ہو چکے ہیں - حفیظ ہوشیار پوری ، سید نصیر احمد جو سید نذیر نیازی کے چھوٹے بھائی تھے اور غالباً کم ہی لوگوں کو یاد ہوگا کہ وہ حلقہ ارباب ذوق کے بانیوں میں سے تھے - مرحوم تقریباً آٹھ سال پنجاب کے محکمۂ دیہات سدھار میں میرے ساتھ پبلسٹی کارک بھی تھے اور تیسرے ناصر کاظمی جو اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے اور حمید نسیم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے علاوہ ان سے ایک بڑی حد تک متاثر بھی تھے -

اس زمانے تک شاعری میں میری دلچسپی ظفر علی خاں کی ہفتہ وار سیاسی نظموں اور مولانا محمد علی (جنھیں پاکستان نے جوہر کے نام سے مشہور کر دیا ہے) کے کلام تک محدود تھی - ظفر علی خاں کا ہنگامی کلام قائدِ اعظم کی تقریروں کی طرح مجھے ایک بڑی حد تک زبانی یاد تھا - نظم یا شعر میں میری دلچسپی زیادہ تر سیاست اور صحافت تک محدود تھی - حفیظ ہوشیار پوری ان دنوں سعدی پارک میں رہا کرتے تھے اور "کاروانِ ادب" کا مشاعرہ ان کے مکان کے نزدیک ہر جمعرات کی شام کو منعقد ہوا کرتا تھا - اس مشاعرے میں کئی نام ور شاعر کہ جن میں احسان دانش بھی شامل تھے شریک ہوتے تھے - میں بھی اگر اس مشاعرے کے سامعین میں نہیں تو تماشائیوں میں ضرور تھا - اس دلچسپی کی زیادہ تر وجہ سرکاری

ملازمت کی دن بھر کی کوفت کے احساس سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا - یہ تھا وہ ماحول جس میں ناصر کاظمی سے میری ملاقات ہوئی - تعارف کرانے والے صاحب ایک جواں سال شاعر تھے جو غزل پر غزل ان تھک گائے چلے جاتے تھے - کسی اور شاعر کی غزل کو بھی وہ مردِ مومن کی گم شدہ حکمت سمجھ کر اپنا لیا کرتے تھے اور مجھ جیسے عامیوں پر اپنی شاعری کا سکہ جما لیا کرتے تھے - اب وہ لاہور میں نہیں ہیں اور غالباً شاعری سے دست کش ہو چکے ہیں - کیونکہ شاعری کے ضمن میں ان کا نام آج کل سننے میں نہیں آتا - ناصر کی غزل پہلی بار میں نے انھی کے لحنِ داؤدی سے سنی تھی - یہی صاحب ناصر کو میرے پاس لائے بھی تھے - یہ برّعظیم کی تقسیم سے دو یا اڑھائی سال پہلے کا واقعہ ہے - اس کے بعد ناصر کاظمی قریب ہر جمرات کو مشاعرے سے پہلے میرے پاس آیا کرتے - بعد میں صحبتیں بڑھتی گئیں - ان محفلوں میں مرحوم خواجہ اسد اللہ ، خواجہ عبدالرشید جو محکمۂ انکم ٹیکس کے ایک افسر اعلیٰ تھے ، حفیظ ہوشیار پوری اور سید نصیر احمد بھی اکثر شریک ہوتے تھے -

ناصر کی وہ غزل کہ جس کی وساطت سے ہمارا تعارف ہوا ان کے مطبوعہ کلام میں نہیں ہے - یہ غزل ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی غالباً میرے پاس محفوظ ہے اور یہی وہ غزل ہے جو پہلی بار انھوں نے ریڈیو پر اپنے بے پناہ ترنم سے سنائی تھی - شاید اس کے چند اشعار آپ سننا چاہیں :

تمنا خون بن کر زیبِ مژگاں ہوتی جاتی ہے
بجھا جاتا ہے دل ہستی فروزاں ہوتی جاتی ہے

نظر سے دور ہے اور دل میں پنہاں ہوتی جاتی ہے
تجلی دوست کی جانِ رگِ جاں ہوتی جاتی ہے

یہ ذکرِ خیر و شر یہ جنت و دوزخ کے افسانے
طبعیت اور بھی مائل بعصیاں ہوتی جاتی ہے

مجھے حیراں نگاہی آخر اُس عالم میں لے آئی
جہاں اُن کی نظر میری نگہباں ہوتی جاتی ہے

ترے اہلِ وفا کو اور مشکل ہو گیا جینا
قیامت کیا یہ اے حسن، پشیماں ہوتی جاتی ہے

گزرتے جا رہے ہیں سانحاتِ زندگی ناصر
شبِ غم رفتہ رفتہ صبحِ خنداں ہوتی جاتی ہے

اس زمانے میں ناصر کی ایک اور غزل بھی مشہور تھی جس کا غالباً صرف ایک آدھ شعر ان کے پہلے مجموعے میں شامل ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ تھا:

بڑھتے ہی جا رہے ہیں آلام زندگی کے
تو مہرباں نہیں ہے اب کیا کریں گے جی کے

جب وہ یا حمید نسیم اسلامیہ کالج کے کسی مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو انہیں نہایت خاموشی سے سنا جاتا۔ اس میں رعبِ سخن اور ترنم کی دل کشی برابر کے کارفرما تھے۔ اب کم ہی لوگوں کو یاد ہوگا کہ ان کے ترنم میں کتنی جاذبیت اور دل کشی تھی اور جب انہوں نے ترنم سے پڑھنا چھوڑ دیا تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی شاعری کو گلے کے زور سے نہیں منوانا چاہتے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب ناصر کی شاعری اور شخصیت دونو ابھر رہے تھے۔ ان کی خودی ان دنوں بھی زوروں پر تھی۔ ظاہراً وہ کم ہی کسی سے اصلاح لیتے تھے اور نہ ہی کسی کو اپنا استاد ماننے کے روا دار تھے۔ بلکہ ذہنی طور پر اپنا شمار اساتذہ ہی میں کرتے تھے۔ لیکن مختلف صحبتوں میں بیٹھ کر کبھی نہ کبھی ان کے کسی نہ کسی شعر میں اگر اصلاح نہیں تو تبدیلی ہو ہی جاتی تھی۔ دو مثالوں کا تو خود میں بھی شاہد ہوں۔ ان کی ایک غزل میں، جس کا مطلع ابھی سنا چکا ہوں، دو شعروں کی ترمیم حفیظ ہوشیار پوری کے زیرِ اثر ہوئی تھی۔ اصل شعر کچھ اس طرح تھے۔

کچھ راکھ کچھ پتنگے سہمی ہوئی سی شمعیں
دل سوز ہیں مناظر بزمِ سحر گہی کے

اب تک مری نگاہیں حیرت زدہ ہیں ناصر
وہ آ چکے کبھی کے وہ جا چکے کبھی کے

ان کی ایک اور مشہور غزل کا ایک شعر شروع میں یوں تھا:

دل نے خیالِ ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

اس شعر پر میرا ذاتی تبصرہ یہ تھا کہ اس کا پس منظر کچھ biological سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ غزل جب ناصر نے پہلی بار "کاروانِ ادب" میں پڑھی تو یہ مصرع "برسی ہیں ٹوٹ ٹوٹ کے رحمت کی بدلیاں" مجید لشاری کے کہنے پر "برسی ہیں جھوم جھوم کے رحمت کی بدلیاں" کر دیا گیا۔ ان کے مطبوعہ کلام میں اس شعر کو حذف کر دیا گیا ہے۔

ایسی مثالوں کی یاد دہانی کرانے میں جو اب غالباً کسی کو بھی نہ یاد ہوں میرا مقصد خدانخواستہ ناصر کو خفیف کرنا نہیں ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنا بھی بڑا ہو اُس کا بھی بچپن ہوتا ہے اور اُس کا ذہنی ارتقا بھی عمر بھر اپنی منازل طے کرتا رہتا ہے۔

ناصر کے ہم عصروں میں کئی شاعر ایسے تھے جو مشہور اساتذہ کی شاعری کے زور پر اور اپنے خوش گلو ہونے کی بنا پر یا کسی اور خوبی کی بدولت اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے منوا رہے تھے۔ اُس وقت یہ وبا عام تھی۔ دروغ برگردنِ راوی مگر ایک جیّد شاعر کی نسبت مشہور تھا کہ جب کبھی کوئی طرحی مشاعرہ ہوتا ہے تو اپنے شاگردوں کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لیے وہ درجنوں اشعار لکھ ڈالتے ہیں۔ ہر پانچ یا چھ شعروں کے بعد مقطع اور مقطع کے بعد ایک نیا مطلع شروع ہو جاتا تھا۔ پھر قینچی سے کاٹ کاٹ کر شاگردوں میں حسبِ مراتب غزلیں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ سن کر میرے منہ سے ایک پھبتی نکل گئی کہ فلاں غزل پڑھنے والے فلاں شاعر کی کترن ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر مجھ جیسے عامی سے ایک شاگرد پیشہ کی غزل کے لیے داد طلب ہوئے۔ میں نے کہا "مشاعرہ تو بہت اچھا تھا لیکن اس میں کترنیں بہت چلی تھیں۔" سو ایسے ماحول میں جہاں شاعری کی عصمت محفوظ نہیں تھی ممکن ہے بعض حاسدوں نے ناصر کو بھی کچھ عرصے تک کسی کی کترن سمجھ لیا ہو۔ لیکن ناصر کسی وقت بھی کسی کی کترن نہیں تھے۔ اپنی شاعری کا لوہا منوانے میں وہ کبھی بھی کسی کے محتاج نہیں تھے۔ مجھے شروع ہی سے احساس تھا کہ ایک ستارہ ابھر رہا ہے اور باہمی تعلقات میں میں نے کبھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا۔ میں ابھی اُن کی ایک غزل کی چند ترمیموں کا ذکر کر رہا تھا۔ اس غزل کے پس منظر کا ذکر بھی غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کا تعلق

ناصر کی سیرت اور آن کے سوانخ حیات سے ہے اور دوسرے یہ کہ اس وجدانی غزل میں جو واقعاتی عنصر ہے اس کی وجہ سے میری طرف سے ناصر کے ساتھ کچھ وقت کے لیے شکر رنجی ہو گئی - واقعہ یہ تھا کہ ایک شام ناصر ایک دوست کے ساتھ کہ جن کا نام لینا غیر ضروری ہے سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ میں کہ جس کا اب وجود نہیں دیر تک اکل و شرب میں مصروف رہے - آن پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی اور جس حالت میں انہیں وہاں سے آٹھایا گیا اور آن کی رات بسر ہوئی وہ دیکھنے والوں کے بیان کے مطابق مکمل بے ہوشی اور زندگی اور موت کے درمیان کشمکش تھی - مجھے بھی اس بات کا رنج تھا اور حفیظ ہوشیار پوری کو بھی - میرا رنج شاید زیادہ دیر پا تھا - میرے دل سے خواہش ہی نکل گئی کہ ناصر اب میرے پاس آئیں اور وہ بھی کافی دنوں تک میرے ہاں نہیں آئے - ایک شام وہ بہر حال میرے پاس آ گئے اور آتے ہی کہا کہ ایک غزل سنانے آیا ہوں - اور ساتھ ہی اپنے دلآویز ترنم میں غزل شروع کی :

"ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی"

اس غزل میں جو شعر مجھے پسند آیا وہ یہ تھا :

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

یہاں واقع کی طرف بھی اشارہ تھا اور اس سے کہیں زیادہ وہ فن تھا جس کے تحت ایک واقعہ اپنی واقعیت یا انفرادیت کو کھو کر ایک مستقل نفسیاتی یا فلسفیانہ حقیقت کا حامل ہو جاتا ہے -

میں اشارہ کر چکا ہوں کہ ناصر کی طبعیت میں اگر انکسار تھا تو بہت ہی کم - کبھی کبھی میں ان سے کہے بغیر نہ رہ سکتا کہ "ناصر بیہودگیوں سے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش مت کرو" لیکن شاید میرے اختیار میں نہیں تھا کہ اپنا نقطۂ نگاہ ان پر واضح کر سکوں - غالباً ان کی خود شناسی کا تقاضا ہی تھا کہ کسی ایسے انکسار کو اپنے آپ پر مسلط نہ ہونے دیں جو آن کی تخلیقی قوتوں میں سدّ راہ ہو - لیکن بہرحال میں اس بات پر زور دیتا ہی رہا کہ اسی کشمکش کی دنیا میں بحیثیت طالب علم کے وہ نمایاں حیثیت حاصل کریں - اگرچہ وہ علم کے بغیر بھی

اچھے شاعر تھے اور بقول اکبر :

عشق کو دل میں دے جگہ اکبر
علم سے شاعری نہیں آتی

لیکن پھر بھی علم شاعری کو جلا ضرور دیتا ہے - جہاں تک مجھے علم ہے ان باتوں کی طرف اُن کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی -

برصغیر کی تقسیم کے بعد ناصر کی زندگی میں اور ان کی شاعری میں ایک نیا دور شروع ہوا - اُن کے اور ان کے خاندان کے لیے یہ وقت نہایت صبر آزما تھا - نہایت تلخ حقیقتوں کی آئینہ دار وہ غزل ہے جو اس مصرع سے شروع ہوتی ہے :

"کہاں ہیں دوست ہمارے نظر نہیں آتے"

اس غزل کا ایک ہی شعر ان کے مطبوعہ کلام میں شامل ہے - ایسے شعروں کی داد تو مل جاتی تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں - میں اُن سے بار بار کہتا ناصر تمھیں کچھ کام کرنا چاہیے - خود اُن سے پوچھ کر میں نے فیض احمد فیض سے چراغ حسن حسرت کے نام چٹھی لے دی کہ ان کو "امروز" میں موقعہ دیا جائے - یہ چٹھی ناصر کے ہاتھ میں دیکھ کر ایک گُونہ مطمئن ہوگیا کہ اُن کا ایک مسئلہ کچھ نہ کچھ حل ہوتا نظر آ رہا ہے اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا شاید ان کے لیے کوئی دقت طلب بات نہ ہو - ایک مہینہ بعد ناصر میرے پاس آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ امروز میں کام کر رہے ہیں ؟ انھوں نے کہا کہ میں تو وہاں گیا بھی نہیں - میں نے پوچھا کیوں ؟ انھوں نے کہا کہ فیض نے حسرت کو لکھا تھا کہ حامل رقعہ ہذا کا Trial کیا جائے - میں نے یہ سوچا کہ اگر اس آزمائش میں میں ناکام رہا تو آپ کو خفت ہوگی - یہ سن کر میرے غصے کا پارہ چڑھ گیا اور میں نے کہا حقیقت یہ ہے کہ تم کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتے - اس سے کچھ دیر بعد میں طویل عرصے کے لیے کراچی چلا گیا - جب کبھی سال میں ایک بار چھٹی پر آتا اُن سے ملاقات ہو جاتی - کبھی کبھار خط و کتابت بھی ہو جاتی تھی -

ایک بار اور بھی میری ان سے تلخ کلامی ہوئی جس کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتا - اگرچہ میں اُس ڈانٹ کا مستحق نہیں تھا جو مجھے ان کی طرف

سے پلائی گئی - لیکن جب بھی ان کے ساتھ سر راہے ملاقات ہو جاتی تو آن کی طرف سے ہمیشہ گرم جوشی اور احترام کا مظاہرہ ہوتا - آن کی آخری بیماری سے پہلے ایک بار میں انھیں دیکھنے کے لیے ہسپتال گیا اور کافی دیر تک آن کے پاس بیٹھا رہا - اس کے بعد ایک بار ریڈیو پاکستان میں ملاقات ہوئی - آن کی شکل دیکھ کر ہی میں نے محسوس کر لیا کہ ناصر چند دن کا مہمان ہے - یہ غالباً آخری ملاقات تھی -

جب کبھی کسی ایسے دوست کی موت ہو جاتی ہے جو عمر میں مجھ سے چھوٹا ہو اور نام پیدا کرنے کی صلاحیتیں رکھتا ہو تو احساس ہوتا ہے مجھے اپنی ڈھٹائی کا کہ اب تک اس لاحاصل زندگی سے چمٹا ہوا ہوں -

ناصر کے جن احباب نے ان کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے ان میں سے بعض نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ناصر تمام عمر معاشرے کی ناانصافیوں کے خلاف نبرد آزما رہے - میں یہ تو جانتا ہوں کہ وہ زندگی کے آخری ۲۷ سال رہین ستم ہائے روزگار تھے لیکن غالباً ان میں تاب مقادمت نہیں تھی - جس شخص کی قوت عمل ہی محض شاعری تک محدود ہو اس سے زیادہ توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی - اس حقیقت کا اعتراف ہی کہنا چاہیے جو انھوں نے اپنے غیر مطبوعہ شعر میں کیا ہے :

جنوں تیرا تو تھا برہم زن ہستی پہ کیا اے دل
تری کاوش اسیر حبیب و داماں ہوتی جاتی ہے

لیکن بہرحال اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں اس کی خوبیوں اور کوتاہیوں دونو کو دخل ہوتا ہے - ناصر کے شدت احساس نے انھیں بے عمل بنا دیا ہو لیکن ان کی شاعری بھی اسی شدت احساس کی رہین منت ہے اور شاید ان کی جوانی کی موت بھی جس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اک نہال تھا جو آگا اور جل گیا -

* * *

چار گھڑی یاروں کا میلہ

انتظار حسین

۱۹۴۸ع کے اواخر کی بات ہے۔ عسکری صاحب گزرتے گزرتے ''نظام'' کے دفتر میں آکر مجھ سے کہہ گئے کہ پانچ بجے ایک صاحب آئیں گے، ناصر کاظمی ان کا نام ہے، مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو انھیں بٹھا لینا۔ میں نے بے تعلقی سے یہ سنا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بتائے ہوئے وقت پر ایک نوجوان آیا، سانولی رنگت، چھریرا بدن، کالی اچکن۔ عسکری صاحب کو پوچھا۔ میں نے کہا کہ بیٹھ جائیے، آتے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ شخص بے پروائی سے سگریٹ پیتا رہا، میں بے تعلق بیٹھا اپنا کام کرتا رہا۔ عسکری صاحب آئے تو ہم تینوں اٹھ کر کیفے اورینٹ میں، جو اب معدوم ہو چکا ہے، جا بیٹھے۔ وہاں ناصر کاظمی نے غزلیں سنانی شروع کیں۔ مجھ پر کچھ ان غزلوں نے اثر کیا، کچھ عسکری صاحب کی بے تحاشا داد نے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ آج میں ایک نئے شاعر سے متعارف ہوا ہوں۔

اسی نشست میں ناصر نے یہ غزل بھی سنائی تھی:

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

جو عسکری صاحب نے عالمِ فریفتگی میں وہیں نقل کرائی۔ پھر ۱۹۴۹ع کے آغاز کے ساتھ ساتھ یہ غزل ''ساقی'' میں شایع ہوئی اور ساتھ ہی ''جھلکیاں'' میں اعلان ہوا کہ پاکستان کو بالآخر ایک شاعر میسّر آ گیا ہے۔

ان دنوں عسکری صاحب پاکستانی ادب کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اس تلاش میں انھیں ٹھوکریں بھی کم کھانی نہیں پڑیں۔ ایک مرتبہ

ایسی نوبت آئی کہ انھیں ایم اسلم کے ''رقصِ ابلیس'' کو بھی پاکستانی ادب قرار دینا پڑ گیا۔ بات یہ ہے کہ عسکری صاحب کی بھی اس وقت وہی مجبوریاں تھیں جو پاکستان کی تھیں۔ خیر ناصر کاظمی کی دریافت نے انھیں بہت سہارا دیا۔ اب انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جانا کہ پاکستانی ادب کے لیے انھوں نے ایک سچ مچ کا شاعر ڈھونڈھ نکالا ہے۔ مہینوں وہ اپنے کالم "جھلکیاں" میں ناصر کی غزل کا، غزل کے بارے میں ناصر کے اٹھائے ہوئے سوالوں کا، تذکرہ کرتے رہے تا آنکہ ناصر نے نئی نسل کا اعلان کر ڈالا۔ پھر تو عسکری صاحب ہتھتّے سے ایسے اکھڑے کہ کبھی ناصر کا نام نہیں لیا۔

بہرحال یوں میں ناصر سے متعارف ہوا۔ ملاقات اس کے بعد ہوئی۔ ناصر سے میری ملاقات پت جھڑ کے موسم میں ہوئی تھی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے دیکھا کہ سامنے سے ایک شخص چلا آ رہا ہے، اپنی دُھن میں مست، سگریٹ پیتا ہوا۔ نگاہیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئیں۔ غور سے دیکھا تو ناصر کاظمی۔ قریب آنے پر علیک سلیک ہوئی۔ میں نے پوچھا "ناصر صاحب! اس وقت کدھر" جواب دیا ''پتّے دیکھنے جا رہا ہوں۔''

''پتّے؟'' میں چکرایا۔

''ہاں پتّے! آج پتّے بہت گرے ہیں۔ میں لارنس کی طرف جا کے دیکھوں گا۔ آپ بھی چلیں، کیا مضائقہ ہے۔''

میں ساتھ ہو گیا۔ ناصر نے چلتے چلتے کہا ''یہ پت جھڑ کی رت ہے۔ یہ رت مجھے بہت خراب کرتی ہے۔ گرتے پتّوں کو دیکھ کر میں اداس ہو جاتا ہوں۔''

تب مجھے احساس ہوا کہ اس وقت ہوا کتنی تیز ہے اور زرد پتّے کس تواتر سے ایک شور کے ساتھ گرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی مال روڈ وسیع نہیں ہوئی تھی اور نت نئی سواریوں کے شور سے نا آشنا تھی۔ پت جھڑ کی دوپہروں میں یہاں زرد سوکھے پتّوں کا شور ہوتا اور بس۔ زرد پتّے خاموش مال کے بیچوں بیچ بستر کی طرح بچھے نظر آتے۔ کوئی بھولی بھٹکی ہوئی موٹر انھیں روندتی گزرتی تو وہ ایک درد ناک شور کے ساتھ دور تک اس کا پیچھا کرتے۔ بس اسی طرح یہاں مہاجر بھی

کھُلے آسمان کے نیچے جا بجا بکھرے پڑے تھے ۔ ڈالی سے ٹوٹے پیلے پتّوں اور بستیوں سے اکھڑے خستہ حال مہاجروں کو دیکھ کر ایک ہی قسم کی کیفیت دل پر گزرتی تھی ۔ مگر مجھے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ کیفیت ہے کیا ؟ ناصر نے عہد کی اس کیفیت کو آداسی کا نام دیا اور بتایا کہ آداسی میرا بائی کی بہن ہے ۔

جب میں نے پاک ٹی ہاؤس میں اٹھنا بیٹھنا شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ ناصر اتنا اکیلا نہیں ہے جتنا اکیلا وہ مجھے پت جھڑ کی دوپہر میں نظر آیا تھا ۔ وہ تو چلتی پھرتی انجمن ہے ۔ جہاں بیٹھ جاتا ہے وہاں ایک محفل آراستہ ہو جاتی ہے ۔ ہوٹل میں بیٹھے تو ہوٹل میں یاروں کا مجمع اکٹھا ہوگیا ۔ ہوٹل سے نکل کر کسی گھاس کے تختے پر جا بیٹھے تو گھاس پہ سبھا جم گئی ۔ اکیلا تو میں تھا ۔ اندر مستقل موسمِ یاد کی آداس ہوا چلتی رہتی تھی ۔ باہر دوسرا ہی موسم تھا ۔ ترقی پسند ادیب تقسیم کے جواب میں ناقابلِ تقسیم تہذیب اور انسان دوستی کا راگ الاپ رہے تھے ۔ عسکری صاحب نے پاکستانی ادب کی بات کرتے کرتے اسلامی ادب کا مضمون باندھنا شروع کر دیا تھا ۔ میں بھی تھوڑا اس بحث میں الجھا ۔ مگر گم شدہ چہروں ، چڑیوں اور درختوں کی یادوں کا مداوا نہ ہو سکا ۔ آخر کو یہ ہوا کہ میں نے ناصر کو پت جھڑ میں آداس ہوتے دیکھا اور اپنے اندر کی بات باہر لایا ”ناصر صاحب ! ہمارے ادھر شاما چڑیا ہوا کرتی تھی ۔ وہ یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتی ۔“

”شام چڑی ؟“ ناصر چونکا ”شام چڑی کی کیا بات ہے ۔“ اور پھر اس نے شاما چڑیا کو ایسے بیان کیا کہ میں نے جانا کہ شاما چڑیا کو میں نے اب دیکھا ہے ۔ شاما چڑیا کا مسئلہ میرے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا جتنا ترقی پسندوں کے لیے انسان دوستی کا اور عسکری صاحب کے لیے پاکستانی یا اسلامی ادب کا مسئلہ اہم تھا ۔ وہ براہِ راست ہجرت کی اس واردات کا ثمر تھا جس میں میں گھرا چلا آ رہا تھا اور جو تابڑ توڑ افسانے لکھنے کے باوجود میری گرفت نہیں آ رہا تھا ۔ شاما چڑیا پاکستان میں ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ۔ کیا پاکستان میں ساون کی جھڑی لگتی ہے ۔ اور کیا یہاں کی برسات کی شاموں میں مور کی جھنکار سنائی دیتی ہے ۔ پاکستان میں سرسوں کیسی پھولتی ہے اور بسنت کا آسمان کیسا ہوتا ہے ۔ یہ میرے

سوالات تھے مگر ترقی پسند ادب اور اسلامی ادب کی بحثوں میں مجھے ان کی معنویت کا پتہ نہیں چل رہا تھا ۔ ان کی معنویت کو میں نے ناصر کی صحبت میں بیٹھ کر جانا ۔ مگر ناصر موسمِ یاد کی اداس ہوا میں چلتا چلتا کہیں آگے نکل گیا تھا ۔ اس نے اپنے اندر ایک باغ اگا لیا تھا ۔ باہر کی ساری کمی اس اندر کے باغ میں پوری ہو گئی تھی ۔ ناصر جب اس باغ کی سیر کراتا تو میرے اپنے سوال معطل ہو جاتے ۔ ہم سب دوست کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتے ۔ کبھی کبھی ہم میں سے کوئی ایک حیرت کے ساتھ سوال کرتا ۔ مگر ناصر اس طرح وضاحت کرتا کہ اگر کسی دل میں کوئی تھوڑا بہت شک پیدا ہوتا تو وہ فوراً ہی زائل ہو جاتا ۔

''ایک بھڑ مجھے بہت تنگ کر رہی تھی ۔ میں بار بار اسے ہاتھ سے پرے کرتا ۔ بار بار وہ میرے کان پر آ کر بھن بھن کرنے لگتی ۔ سامنے درخت پر بیٹھا کوّا یہ منظر دیکھ رہا تھا ۔ وہ شاخ سے اترا ، بھڑ کو چونچ میں دبایا ، پھر اس بھڑ کو ادھ موا کرکے میز پہ میرے سامنے رکھا اور اڑ کر پھر شاخ پر جا بیٹھا ۔''

''بہت مودب کوّا تھا ۔'' ایک یار نے کسی قدر شک اور طنز کے ساتھ کہا ۔

''یہی سمجھ لو ۔ اصل میں اس کوّے سے میری افہام و تفہیم ہو گئی ہے ۔ جب میں کھانا کھاتا ہوں تو وہ مودب شاخ پہ بیٹھا رہتا ہے ۔ جب تک میں خود روٹی کا ٹکڑا نہ ڈالوں وہ شاخ سے نیچے نہیں اترتا ۔''

کوّے سے بات مور تک گئی ۔ ''مور ویسے تو شہزادہ ہے ۔ مگر شیر کا خادم ہے ۔ جب شیر شکار کھا کر قیلولہ کرتا ہے تو مور اس کے خلال کرتا ہے ۔''

شیر سے ناصر کی مڈھ بھیڑ دو مرتبہ ہوئی ۔ ایک مرتبہ ناصر نے مروت برتی ۔ دوسری مرتبہ شیر طرح دے گیا ۔ ناصر نے مروت اس لیے برتی کہ شیر ببر اس وقت قیلولہ کر رہا تھا ''یار میں نے سوچا کہ اس وقت شیر کو بے آرام نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ میری گولی کی زد میں تھا ۔''

دوسری دفعہ یہ ہوا کہ ناصر نے ابھی بندوق نہیں بھری تھی کہ سامنے جھاڑیوں میں سے ایک شیر نکل آیا ۔ اس نے ناصر کو گھور کر دیکھا

ضرور مگر پھر نظر نیچی کر کے گزر گیا۔

"کیا شیر نظر نیچی کر سکتا ہے؟" ایک یار نے سوال اٹھایا۔

"شیر نظر نیچی تو نہیں کرتا مگر اپنے شکاری کو دیکھ کر شرما جاتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ناصر نے کبھی شیر مارا ہی نہیں تھا۔ شیر مارنے کا انکشاف اس نے دوسرے موقعہ پر کیا جب وہ اپنے ایک کبوتر کی بہادری کے قصے سنا رہا تھا۔ "اس نے بلی کو ایسی خونخوار نظروں سے دیکھا کہ غریب بلی سہم گئی۔"

"بلی کبوتر کو دیکھ کر سہم گئی؟ ...؟"

"تعجب کی اس میں کیا بات ہے۔ میں انہیں دنوں شیر مار کر لایا تھا۔ اس کی چربی میں نے محفوظ کر لی۔ اس کبوتر کو دانہ اسی چربی میں ملا کر کھلایا تھا۔ بس کبوتر شیر بن گیا۔ بلی قریب آتی تو اسے پنجہ مار کر لہولہان کر دیتا تھا۔"

شیر، کبوتر، مور، کوّا، یہ تو خیر اس کے پسندیدہ جانور ہوئے۔ مگر ایک دن وہ مکھی پر رواں ہو گیا "ملکہ مکھی کے دربار میں مجال ہے کہ کوئی مکھی دم مار جائے۔ سب دست بستہ کھڑی رہتی ہیں۔ ملزمین پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر گواہیاں ہوتی ہیں۔ کوئی مکھی حق میں کوئی خلاف گواہی دیتی ہے۔ پھر ملکہ اپنے پر اٹھا کر سزا کا فیصلہ سناتی ہے۔ فیصلہ سن کر ایک مکھی دائیں صف سے اور ایک مکھی بائیں صف سے نکلتی ہے۔ ملزم مکھی کو دونوں مل کر ہلاک کرتی ہیں۔ لاش کو ملکہ کے رو برو پیش کرتی ہیں اور مودبانہ پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔"

اصل میں "پنچ تنتر" سے الگ ناصر کی ایک پنچ تنتر تھی۔ اس پنچ تنتر کے جانور بھی عقل و شعور سے کم مالا مال نہیں تھے۔ ناصر نے ایک مال دار بوڑھیا کا قصہ سنایا جس کی کوٹھی کے لان میں ناگوں کا جوڑا تھا۔ جب کوئی اجنبی کوٹھی میں قدم رکھتا تو ناگ اور ناگن پھنکارتے ہوئے گھاس سے نکل آتے۔ جب بوڑھیا انہیں واپس جانے کا اشارہ کرتی تب وہ سر جھکا کر پھر گھاس میں چلے جاتے۔ خود ناصر کے باغ

میں سانپوں کا ایک عجیب جوڑا تھا ''ہم ہر سال اپنا باغ کسی کے ہاتھ اٹھا دیتے تھے - لیکن اگر کسی غلط آدمی سے سودا ہو جاتا تو سانپ پھن اٹھا کر کھڑے ہو جاتے اور اسے باغ میں گھسنے نہیں دیتے تھے - یہ دیکھ کر ہم اس شخص سے معاہدہ ختم کر دیتے -"

''بڑے مردم شناس سانپ تھے -'' کسی نے ٹکڑا لگایا -

ناصر نے تاؤ کھایا اور کہا ''سانپ کو تم کیا سمجھتے ہو - آدمی کو آدمی نہیں پہچانتا ، سانپ پہچانتا ہے - بس ذرا کاہل ہوتا ہے - ایک دفعہ میں رات گئے گھر پہنچا - دری جھاڑے بغیر اس پر پڑ رہا - میں رات بھر آرام سے سویا - جب صبح ہوئی اور دھوپ نکلی تو دری کے نیچے کوئی چیز سرسرائی - دری جو اٹھائی تو یہ لمبا سانپ - مگر جب اس نے مجھے کچھ نہیں کہا تو میں نے بھی اسے کچھ نہیں کہا - وہ سر سر کرکے بل میں کھو گیا -"

ناصر کے اصطبل کے گھوڑے بھی ماشاء اللہ بہت سمجھدار اور برد بار تھے - اس کے ایک ایک اشارے کو سمجھتے تھے - ہاں ایک عربی گھوڑا جب اس اصطبل میں آیا تو اس نے بہت سرکشی دکھائی - کسی کے قابو ہی میں نہ آتا تھا - ناصر کہنے لگا ''میں نے سوچا کہ میں ہی اسے قابو میں کروں گا - ان دنوں اپنی کاٹھی بنی ہوئی تھی - رانیں ایسی جیسے سونے کی پڑیاں جمی رکھی ہوں - بدن لوہا لاٹھ - میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ، مٹھی میں ایال پکڑے اور اچک کر ننگی پیٹھ پہ بیٹھ گیا - گھوڑے نے مڑ کر غور سے دیکھا کہ یہ کون سوار ہے اور پوئیا چلنے لگا -"

واضح ہو کہ ناصر کا یہ اصطبل اور یہ باغ انبالہ میں تھے - اور انبالہ ناصر کا ما قبلِ تاریخ عہد تھا - ناصر اس عہد کے محیرالعقول واقعات سناتا تھا اور ہم دم بخود سنتے رہتے تھے - مگر جب رفتہ رفتہ ہم نے حیرت کی منزل سے نکل کر شک کی منزل میں قدم رکھا تو انبالہ کے مہاجروں کی تلاش شروع ہوئی - ایک حوالہ دستیاب ہوا اور ایک یار نے اس حوالے سے پوچھ گچھ کے بعد ناصر سے کہا ''ناصر ! وہ بھی تمہارے انبالے کا ہے - وہ تو کہتا ہے کہ ناصر کے خاندان سے میں خوب واقف ہوں - ان کا کوئی اصطبل نہیں تھا -"

ناصر نے بہت متانت سے جواب دیا ''یار بات یہ ہے کہ انبالہ کے لوگ

بہت حاسد تھے - اس لیے ہم نے اپنا اصطبل شہر سے باہر بنایا تھا اور شہر والوں کو اپنے گھوڑوں کی کبھی ہوا نہیں لگنے دی -"

خیر شک کرنے اور سوال اٹھانے کی یہ منزل تو بہت بعد میں آئی تھی - ایک عرصے تک ہم سب یار ناصر کے سحر میں اس طرح رہے کہ بس سنتے تھے اور حیران ہوتے تھے - ایک جادو ناصر کی نئی غزل کا اور ایک جادو ناصر کی نرالی گفتگو کا - ناصر جب اپنے محیرالعقول معرکے سناتا تو ہم حیران ہوتے اور خوش ہوتے - مگر گفتگو میں یکایک کوئی عجب سا موڑ آ جاتا اور ناصر اعلان کرتا کہ میں اداس ہو گیا ہوں - پھر ہم بھی اداس ہو جاتے - وہ کہ ابھی ابھی زندگی کے رنگا رنگ ذائقوں کا سماں باندھ رہا تھا زندگی کی بے ثباتی اور دنیا کی ناپائداری کا ایسا نقشہ کھینچتا کہ ہمیں کائنات ویران نظر آتی - ناصر نے اپنے اداس عہد کو اداس ہونے کے آداب سکھائے - سیکھنے والوں نے اداسی کے آداب کچھ اس کی غزل سے سیکھے ، کچھ اس کے زندگی کرنے کے طور سے سیکھے - کوئی کوئی یار اداسی کی منزل سے گزرا اور گریہ کے مقام تک پہنچا - آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر گورنمنٹ کالج نیو ہوسٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر مظفّر علی سید نے ناصر سے غزل سنی ، گریہ کیا اور کھمبے سے سر پھوڑ کر لہولہان ہو گیا - مگر مظفّر نے گریہ کا مضمون ایک رنگ سے نہیں کئی رنگ سے باندھا - ایک رات ستاروں کے سائے میں ایک خاموش رستے پر چلتے ہوئے ناصر سے الگ اس نے احمد مشتاق سے غزل سنی - پھر لرزتے ہاتھوں سے مشتاق کی ہتھیلی تھامی - مشتاق نے محسوس کیا کہ کوئی گرم بوند ہتھیلی پر گری ہے - وہ ایک تازہ آنسو تھا جو ابھی مظفّر کی آنکھ سے ٹپکا تھا - اور مظفّر نے رقّت بھری آواز میں کہا "مشتاق ، میں اس غزل کی داد اسی طرح دے سکتا ہوں -" مشتاق تنگ ظرف نکلا - اگلے دن یہ خبر ناصر تک پہنچی - ناصر سے ہم سب یاروں تک پہنچی :

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

میرا یہ مطلب نہیں کہ ناصر نے یہ شعر اس واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا - اگرچہ ہے یہ شعر اسی زمانے کا ہی -

گریہ ناصر کا مسلک نہیں تھا ، نہ شاعری میں نہ زندگی میں - اس عاشق کا مسلک تھا آداسی اور رتجگا - یوں ناصر کسی وقت بھی آداس ہونے کا اعلان کر سکتا تھا - مگر آداس ہونے کا جو اعلان آخر شب میں ہوتا تھا وہ کچھ اور ہی عالم رکھتا تھا - آداسی اس سمے اپنی بہن کے ساتھ وارد ہوتی تھی - آدھی رات کے بعد ناصر میر کو بالعموم بھول جاتا تھا - پھر اسے میرا بائی یاد آتی تھی - کبھی سور داس کا کوئی بھجن ، کبھی کبیر کا کوئی دوہا - ناصر کے شعر کے لہجہ کو جاننے سمجھنے کی خاطر میر کے ساتھ ان لوگوں کو بھی یاد رکھا جائے تو اچھا ہے -

رتجگے سے بچنے کی میں نے ایسے کوشش کی جیسے سادہ دل لوگ شرابی کی صحبت میں بیٹھ کر شراب سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں - خیر رتجگے کی لذت سے آشنا ہو جانے کے بعد بھی مجھے اس پر اصرار رہا کہ آدمی کو شب کی کسی نہ کسی منزل میں گھر کا رخ ضرور کرنا چاہیے - ناصر کا موقف یہ تھا کہ رات ایسی شے نہیں کہ اسے چھت کے نیچے ضایع کیا جائے - اور ناصر نے ان دنوں واقعی کوئی رات چھت کے نیچے ضایع نہیں کی - یہ تو شادی کے بعد ہوا کہ رات کے پچھلے پہر وہ گھر جانے لگا تھا - مگر کیسے جاتا تھا - یہ ابھی مت پوچھیے - ابھی مجھے ان راتوں کے پچھلے پہر کو یاد کر لینے دیجیے جو گھر جانے کے خیال سے یکسر پاک تھیں - مال روڈ سے دور انارکلی سے پرے بے چراغ سڑک کے کسی فٹ پاتھ پر جاڑوں کے آسمان کے نیچے ایک دیا ٹمٹما رہا ہے اور چائے بن رہی ہے - کوئی کوئی تانگے والا تانگہ روک کر چائے کا پیالہ اندر آتارتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے - ایک ٹوٹی پھوٹی میز کے گرد انجر پنجر کرسیاں بچھی ہیں - ہماری منڈلی جمی ہے - پچھلی رات کا سارا جادو ناصر کی گفتگو میں سمٹ آیا ہے - وہ لگاتار بول رہا ہے اور پچھلے پہر کے ڈھائی تین ساتھی دم بخود سن رہے ہیں - قریب کی کسی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے اور ناصر دفعتاً چپ ہو جاتا ہے - اذان ختم ہو جاتی ہے مگر ناصر خیالوں میں کھویا چپ بیٹھا ہے - وہ شروع ہونے لگتا ہے کہ کہیں دور چڑیا بولتی ہے - ناصر پھر چپ ہو جاتا ہے - ایک چڑیا بولتی ہے ، پھر دوسری چڑیا بولتی ہے - پھر قریب و دور کے درختوں پر چڑیاں اتنا چہچہاتی ہیں کہ فضا ان کے شور سے بھر جاتی ہے - اور ناصر ڈھلی ہوئی آواز میں کہتا ہے "چڑیوں کی

صبح کی آواز بہت اداس کرنے والی ہوتی ہے۔" پھر اداسی کے ساتھ ساتھ اس پر نیند چھانے لگتی ہے۔ آنکھیں بند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ناصر سو جاتا ہے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ناصر چونک کر آنکھیں کھولتا ہے۔ چائے کی آخری پیالی پیتا ہے اور اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یار اپنے اپنے گھر کا رستہ لیتے ہیں اور ناصر؟ ناصر کے لیے لازم نہیں کہ وہ گھر ہی واپس جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چینیز لنچ ہوم یا ٹی ہاؤس میں جا کر ہاتھ منہ دھوئے اور پھر کافی ہاؤس میں پہنچ کر دن کے ساتھیوں کا انتظار کرے۔

ویسے کبھی کبھی ناصر کو گھر کی طرف جاتے ہوئے بھی دیکھا جاتا تھا۔ اس گھر کی صورت یہ تھی کہ پرانی انارکلی کی ایک گلی میں کسی پرانے سے مکان کا بس ایک کمرہ ناصر کے تصرف میں تھا۔ یہ کمرہ ایسا تھا کہ دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں نظر آتا تھا۔ ساز و سامان کے نام کچھ کتابیں کچھ کاغذ جہاں تہاں بکھرے ہوئے۔ ایک پلنگ اور ایک تتر بتر بستر۔ "کلیاتِ میر" اس بستر کا تکیہ تھا۔ والد صاحب پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ والدہ انہیں برسوں میں دنیا سے سدھاری تھیں۔ ناصر اب اکیلا تھا۔ اس کے سر پر کوئی سایہ نہیں تھا۔ ہاں وہ خود ایک چھوٹے بھائی کے سر کا سایہ تھا۔ جانے وہ اس ذمے داری کو کیسے نبھاتا تھا۔ ناصر اپنے والد صاحب کو تو میر متقی نہ بنا سکا۔ مگر اپنی والدہ صاحبہ کے علم و فضل اور منجھے ہوئے ادبی ذوق کا ذکر وہ ان کے گزر جانے کے بعد ایک مدت تک بڑے جوش و خروش سے کرتا رہا۔ میر متقی نے بیٹے سے کہا کہ اے فرزند عشق کیا کر۔ ناصر کی والدہ صاحبہ نے ناصر کو نصیحت کی کہ بیٹے میر کو پڑھا کرو۔ میر کے ذکر سے تنگ آ کر ایک روز میں نے ناصر سے انیس کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگا "میری والدہ نے بچپن ہی میں مجھے سارا انیس پڑھا دیا تھا۔"

نگھرے ناصر کی ہم سفری میں ہم یار بھی نگھرے بن گئے۔ نہ تن بدن کا ہوش نہ کھانے پینے کی سدھ۔ بیٹھے تو سارا دن کسی چائے خانے کے گوشے میں بیٹھ کر گزار دیا۔ چلنا شروع کیا تو رات بھر چلے اور شہر کی ایک ایک گلی کھوند ڈالی۔ اس عالم میں گرمیوں کے پہاڑ سے دن کتنے مختصر نظر آتے تھے اور جاڑوں کی لمبی رات کتنی چھوٹی لگتی تھی۔

انھیں تپتی دوپہروں اور لمبی راتوں کے سفر میں ہم نے مل جل کر اپنے آپ کو دریافت کیا اور نئی نسل کے ظہور کا اعلان کیا ۔ پاکستان کی ادبی تاریخ میں یہ پہلا اعلانِ بغاوت تھا ۔ اصل میں ہم باقی ادیبوں سے الگ ایک اور ہی سطح پر جی رہے تھے ۔ اس سطح کو دیوانگی کی سطح کہہ لیجیے ۔ مگر یہ دیوانگی پچھلے عہد کے دیوانگیوں سے الگ اپنا رنگ رکھتی تھی ۔ ہر عہد اپنے دیوانے الگ لے کر آتا ہے :

ہمارے دور میں دیوانگی کے طور ہیں اور

ناصر کی دیوانگی نے اس آشوب کے بطن سے جنم لیا تھا جس نے بہت بستیوں کو ویران کر دیا تھا اور بہت گھر والوں کو بے گھر بے در بنا دیا تھا ۔ ایک خلقت تھی کہ رنجِ ہجرت کھینچ رہی تھی اور کتنے خانہ برباد تھے کہ یادوں کے بجھے ہوئے سویرے آنکھوں میں چھپائے پھرتے تھے ۔ ناصر کا زندگی کرنے کا طور اور شعری رویہ دونوں کی معنویت اسی سیاق و سباق میں کھلتی ہے ۔ آخر کوئی تو وجہ تھی کہ ناصر کی دیوانگی اور شاعری اس عہد کو لے آڑی تھی ، جو دل زدہ نوجوان دیوانگی کا بارِ امانت آٹھانے کی ٹھانتا تھا وہ اپنے خواب لے کر اس شب گزیدہ کی انجمن میں شامل ہو جاتا تھا اور جو نیا ذہن تخلیقی لگن سے آشنا ہوتا تھا وہ اس کے ساتھ لگ لیتا تھا ۔ پھر کسی نے آ کر منادی کی کہ ایشیا کا سب سے بڑا مصور آیا ہے اور کافی ہاؤس میں بیٹھا ہے ۔ ہم باری باری اس کا درشن کرنے کافی ہاؤس گئے ۔ وہ تجریدی اسلوب میں تصویر بناتا تھا اور شاکر علی اپنا نام بتاتا تھا ۔ ہم میں سے کتنوں کو اسی تجریدی اسلوب نے لوٹ لیا ۔ اور ہماری نئی نسل ادیبوں اور مصوروں کی ملی جلی نسل بن گئی ۔

نئی نسل کے اعلان نے اچھی خاصی اتھل پتھل پیدا کی ۔ حلقۂ ارباب ذوق نے سزا دینے میں سب سے زیادہ عجلت دکھائی ۔ بات یہ تھی کہ ناصر تو پہلے بھی فراق کے سوا باقی شاعروں کو واجبی واجبی ہی مانتا تھا ۔ مگر اب اس نے فراق کے بارے میں بھی یہ سوال آٹھا رکھا تھا کہ "کون فراق !" سو باقی کس گنتی میں تھے ۔ حلقے میں بیٹھے ہوئے سینیئر شاعروں نے غیظ میں آ کر ناصر کو اور اس کے ساتھ مجھے و نیز مظفر علی سید کو نکال باہر کیا ۔ شہرت بخاری نے قیوم نظر سے ہمارے لیے

بہت رحم کی اپیلیں کیں ۔ مگر وہاں ایک پیش نہ گئی ۔ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کی سیاست بھی حلقہ میں در آئی تھی کہ حلقہ کے کچھ لوگ اہل مدرسہ میں شامل ہو گئے ۔ سو انہیں دنوں پروفیسر سید وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی حلقے سے نکالے گئے ۔

ہماری نئی نسل کا اتحاد پاکستانی قوم کے اتحاد کے بقدر نکلا ۔ ادھر پرانی نسل سے لڑائی ٹھنی ہوئی تھی آدھر گھر میں تفرقہ پڑ گیا ۔ یوں ناصر کی شخصیت میں بہت جادو تھا ۔ اور بھیگتی مسوں والوں پر تو جانے وہ کیا پڑھ کر پھونکتا تھا کہ وہ اسی کے ہو رہتے تھے ۔ آدمی ٹٹول کر چاہے کوئی لاتا ، ٹی ہاؤس پہنچتے پہنچتے وہ ناصر کا بن جاتا تھا ۔ سو مظفّر علی سید کو باری باری کرکے غالب احمد ، حنیف رامے اور احمد مشتاق سے دستبردار ہونا پڑا ۔ ناصر نے دھیرے دھیرے کرکے سب اچھا مال سمیٹ لیا اور مظفّر کے لیے خالی شہزاد احمد چھوڑ دیا ۔ مگر اس حوصلہ مند نے اسی خاک کی چٹکی سے ایک نیا جہان تعمیر کرنے کی ٹھانی ۔ خیر ادھر تو نیا جہان کیا تعمیر ہونا تھا مگر آدھر شب گزیدوں کی انجمن میں ایک اکل کُھرّے شخص کے آ جانے سے یار ٹوٹ ٹوٹ کر اور روٹھ روٹھ کر جانے لگے ۔

اس اکل کُھرّے شخص کا نام شیخ صلاح الدین تھا ۔ شیخ صاحب ناصر کی انجمن سے اٹھ کر جانے والے فضلا کا نعم البدل ثابت ہوئے ۔ وہ حوالوں پر قناعت نہیں کرتے تھے ، ایک سانس میں پوری کتاب بول جاتے تھے ۔ شیخ صاحب نے حنیف رامے کو بعد میں گود لیا ۔ شروع میں تو انہیں جتنا فلسفہ برآمد کرنا ہوتا تھا وہ ناصر کی غزل ہی سے برآمد کرتے تھے ۔ یار لوگ سمجھتے ہیں کہ ناصر نرا شاعر تھا ۔ علم و فضل سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی ۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک ڈیڑھ عالم فاضل وہ آس پاس ضرور رکھتا تھا ۔ ایک زمانے میں قدیم اردو شاعری اور تذکروں کے بارے میں اس نے مظفّر علی سید سے اچھا خاصا استفادہ کیا ۔ میر تو خیر ناصر کا اوڑھنا بچھونا تھا ۔ صف اول کے دوسرے شاعروں کے مطالعے میں بھی اس نے مضائقہ نہیں سمجھا ۔ باقیوں کے بارے میں اس نے مظفّر پر اعتبار کیا ۔ اسے یقین تھا کہ رند ، صبا اور وزیر جیسے شاعروں کے یہاں کوئی اچھا شعر ہوا تو مظفر خود ہی چٹکی میں پکڑ کر لائے گا اور میز پر

اس کے رو برو رکھ دے گا - (اسی طرح جس طرح کوے نے بھڑ کو چونچ میں پکڑ کر باغ کی مالکہ کے رو برو رکھ دیا تھا -) اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھا شعر اردو شاعری کے کسی بھی کونے میں ہوا مظفؔر کی نظر سے کبھی نہ بچا - اس نے تو چرکین کے کلام میں سے بھی ایک ایسا شعر برآمد کر لیا تھا جو بقول اس کے پورے بادلیئر پر بھاری تھا - اور ایک پرانے شاعر اشرفی کے یہاں سے ایک ایسا شعر نکالا جو معاشی شعور سے مملو تھا :

کیچڑ میں کوڑی دیکھیں تو دانتوں سے لیں اُٹھا
اے اشرفی زمانہ تو کنگال ہو گیا

ناصر نے یہ شعر سنا اور اردو کی ساری ترقی پسند شاعری سے بے نیاز ہو گیا - مغربی شاعری اور مصوری کے بارے میں ناصر نے اپنے ابتدائی زمانے میں اس وقت کے اپنے ایک نوجوان مداح اختر محمود سے بہت استفادہ کیا تھا - جب یہ نوجوان سی ایس پی کے امتحان میں کامیاب ہو کر لاہور سے چلنے لگا تو اس نے ناصر کا ہاتھ شیخ صاحب کے ہاتھ میں پکڑا دیا - شیخ صاحب نے یہ ہاتھ بہت مضبوطی سے پکڑا اور مغرب کا سارا فلسفہ ، ارسطو سے وائٹ ہیڈ تک ، ناصر کے اندر اتار دینے کا بیڑا اٹھایا -

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ناصر کا سارا علم سماعی تھا - فلسفے کی کتابیں اس نے کتنی پڑھی تھیں ، یہ شیخ صاحب سے پوچھیے - میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ ناصر کا کتاب پڑھنے کا طریقہ کیا تھا - ادب کی کتابی معلومات رکھنے والوں نے جب ناصر کی کتابی معلومات پر شک کرنے شروع کیے تو ایک شام ناصر نے اعلان کیا کہ "میں ڈاکو ہوں -"

"ڈاکو ؟" یاروں نے حیرت سے ناصر کو دیکھا -

"ہاں ڈاکو !" ناصر نے کہا "بات یہ ہے کہ دو ٹکے کے چور یہ کرتے ہیں کہ گھر کے ایک ایک کمرے کو ٹٹولتے ہیں اور سارا مال و اسباب ڈھونے کی کوشش کرتے ہیں - بڑے ڈاکو یہ نہیں کرتے - وہ سیدھے اس کمرے میں جاتے ہیں جہاں سیف رکھا ہے اور مالک کنجیاں دبائے سو رہا ہے - مالک کے سینے پہ پستول رکھ کے کنجیاں رکھوائیں ، سیف کھولا - زر و جواہر نکالے اور باقی ساز و سامان کو دیکھے بغیر یہ جا وہ جا - میں بھی کتاب کے اندر ایسے داخل ہوتا ہوں جیسے ڈاکو کسی حویلی میں

داخل ہوتا ہے ۔''

کلیاتِ میر تو خیر ناصر کے لیے ایسی حویلی تھی جس کے ہر گوشے میں ایک دفینہ دبا تھا ۔ اس حویلی کا اس نے کونہ کونہ چھان مارا ۔ مگر وہ ہر حویلی کو میر صاحب کی حویلی سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا ۔ وہ سونگھتا سونگھتا سیف والے کمرے میں جاتا تھا اور اپنا کام کر کے لپک جھپک واپس ہو لیتا تھا ۔

شیخ صاحب کے وارد ہونے کے بعد ناصر کے شب و روز کی تقسیم یوں ہوئی کہ دوپہر کو فلسفہ اور رات کو شاعری اور جادوگری ۔ اس سے پہلے کا اس کا طور یہ تھا کہ دوپہر تک کا وقت کافی ہاؤس میں ان یاروں کے ساتھ گزارتا تھا جو غمِ روزگار سے بے نیاز تھے ۔ ان میں ایسے بھی تھے جو گھنٹوں بولتے تھے اور یہ شکایت لے کر اٹھتے تھے کہ میرا فقرہ پورا نہیں ہوا ۔ دوپہر کے آتے آتے ناصر فقرے کے پورا ہونے کا انتظار کیے بغیر کافی ہاؤس سے اٹھتا اور ٹی ہاؤس آ بیٹھتا ۔ ٹی ہاؤس ان دنوں ، دفتروں کے ختم کے ساتھ دوپہر سے گرم ہونا شروع ہوتا اور رات ساڑھے دس گیارہ بجے تک گرم رہتا ۔ ادیبوں کی ٹولیاں آتی رہتیں اور جاتی رہتیں ۔ ناصر ہر ٹولی کو خوش اسلوبی سے نبٹاتا ۔ یاروں کے شعر سنتا ، اپنے شعر سناتا ، پھر باتوں سے جادو جگاتا ۔ لیکن شیخ صاحب کے ورود نے اس وظیفے میں خلل ڈالا ۔ اب ناصر کی طبیعت خالص ادیبوں کی صحبت سے اچاٹ ہو گئی ۔ دوپہر کے وقت کبھی شعر سنتے سنتے ، کبھی شعر سناتے سناتے کبھی باتیں کرتے کرتے شیخ صاحب کو گم متھان دیکھ کر وہ کسمساتا اور یاروں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتا ۔ اشارہ پا کر ایک یار آہستہ سے اٹھتا اور باہر نکل جاتا ۔ پھر بہانے بہانے دوسرا آٹھتا اور باہر نکل جاتا ۔ پھر تیسرا ، پھر چوتھا ۔ اور آخر میں خود ناصر ، کبھی پان کھانے کے بہانے کبھی سگریٹ کے بہانے ۔ ٹی ہاؤس سے نکل کر سامنے بڑھ کے نیچے پان والے کی دوکان پر آتا ۔ پان سگریٹ لیتا اور دیکھتا جاتا کہ ٹی ہاؤس سے کوئی باہر تو نہیں آیا ہے ۔ وہاں سے چل کر چینیز لنچ ہوم کے سامنے پہنچ کر ایک دفعہ پھر مڑ کر دیکھتا کہ کوئی ادیب تعاقب تو نہیں کر رہا ۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد سٹاک سے چینیز کے اندر ۔ اصل میں ان دنوں ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں گھومنے پھرنے والے ادیب اور دانش ور

ناصر کو دم نہیں لینے دیتے تھے - اس کی ٹوہ لیتے پھرتے - جس ریستوران کے جس گوشے میں بیٹھا نظر آتا وہاں اکٹھے ہوتے چلے جاتے - چینیز کی بالائی منزل جائے فرار کے طور پر منتخب کی گئی تھی اگرچہ کبھی کبھی یہاں بھی چھاپا پڑ جاتا - بہرحال گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں ناصر نے اور ناصر کے ساتھ ہم یاروں نے شیخ صاحب کا فلسفہ بہت سنا - مگر پھر یوں ہوا کہ ناصر کو فلسفے کے بیچ نیند آنے لگی - سچی بات یہ ہے کہ شیخ صاحب کے فلسفے سے ناصر کو سونے میں بہت آسانی ہو گئی تھی - آگے ناصر کسی وقت سو نہیں سکتا تھا - رات کو وہ خود نہیں سوتا تھا - دن کو ادیب نہیں سونے دیتے تھے - جہاں اونگھ آئی کوئی غزل گو آن دھمکا "یار ناصر نئی غزل ہو گئی ہے ، تم نے کچھ کہا -" اس کے بعد نیند غائب اور شاعری شروع - اب جو ادیبوں کی خلقت سے الگ ایک کونہ نصیب ہوا تو ناصر نے سونے کے لیے وقت نکالا - بیٹھتے ہی کہتا "شیخ صاحب آج کام کی بات ہوگی - اگر آپ نے کام کی بات نہ کی تو میں آپ کو جان سے مار ڈالوں گا -" شیخ صاحب سنی ان سنی کرتے اور شروع ہو جاتے - ناصر سنتا رہتا ، سنتا رہتا - پھر اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگتی - غنودگی آمیز آواز میں کہتا "میں سوتا ہوں ، جب کوئی کام کی بات ہوگی تو جاگ جاؤں گا -" پھر وہ سو جاتا - رفتہ رفتہ خراٹے لینے لگتا - خراٹوں کے پس منظر میں فلسفہ پر گفتگو جاری رہتی - شیخ صاحب کا ایمان تھا کہ ناصر سوتے میں بھی سنتا ہے - ناصر پوری نیند لیتا ، پھر آنکھیں مل کر بولتے ہوئے شیخ صاحب کو دیکھتا ، پھر باتھ روم کی طرف چلا جاتا - ہاتھ منہ دھو کر واپس آتا ، چائے کا آڈر دیتا اور گفتگو میں ایسے شامل ہو جاتا جیسے اس نے ایک ایک بات سنی ہے -

ایسی دوپہریں بھی گزری ہیں جب ناصر کے خراٹوں کے بیچ مجھ اکیلے کو سارا فلسفہ سننا پڑا - مگر خیر حنیف رامے کی شمولیت نے ہم سب یاروں کا بوجھ ہلکا کر دیا - وہ بار امانت جو ہم مل کر نہ اٹھا سکے تھے اس اولوالعزم نے اکیلے اٹھانے کی ٹھانی - بہرحال مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ ناصر نے خالص غزل گویوں کی محفل سے بالعموم کنّی کھائی - اس نے ایسی صحبتیں تلاش کیں اور اپنے اردگرد ایسی فضا پیدا کی جس میں علم و فضل کا چرچا بہت تھا - ناصر کو کچھ یہ خیال ہو گیا تھا کہ یاروں نے کتابوں سے

جو علم حاصل کیا ہے وہ ضایع نہیں جانا چاہیے ۔ کیوں نہ اسے ان سے لے کر کسی بہتر استعمال میں لایا جائے۔ وہ تو صفدر میر تک کا بوجھ بٹانے کے لیے تیار تھا ۔ مگر صفدر کے سر کا بوجھ تو اخبار کے کالم سے ہلکا ہونا تھا ۔ ناصر نے ٹی ہاؤس میں سعید محمود کو بہت چہکتے بولتے دیکھا تو اس سے بھی مال رکھوانے میں تامل نہیں کیا ۔ سجاد باقر رضوی کی گھن گرج دیکھ کر اسے بھی ٹوہ لیا کہ کیا خبر ہے اس مشتِ خاک میں بھی کوئی جواہر ریزہ رلا ملا پڑا ہو ۔

علم و فضل سے اتنے شغف کے باوجود ناصر کو علمی ثقاہت سے سخت بیر تھا ۔ عالم فاضل دوستوں سے بہت فیض صحبت اٹھایا مگر کیا مجال کہ اندازِ بیاں میں فرق آ جائے ۔ غالب کے بارے میں بات چل نکلی ۔ کہا کہ غالب کو ہاتھی کی سواری اور فارسی کے شوق نے مارا ۔ اردو دیوان میں سے کا ، کے ، کی نکال دو تو باقی سب فارسی ہے ۔ جوش کے کسی مداح نے جوش کا ذکر چھیڑ دیا ۔ ناصر نے کہا "جوش کی لغت الاماں الاماں ! مردِ خدا تھری ناٹ تھری سے پدی کا شکار کرتا ہے ۔" فراق کا ناصر یوں بہت مداح تھا ۔ مگر ایک دن تعریف کرتے کرتے بولا ''فراق کی غزل پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے کسی بہت خوبصورت عورت کے مونچھیں نکل آئی ہوں ۔''

ویسے ایک زمانے میں ناصر نے تابڑ توڑ کئی ایسی غزلیں لکھ ڈالیں کہ میں شک میں پڑ گیا ۔ بس یہ ڈر کہ کہیں شیخ صاحب کی صحبت میں ناصر کی غزل کے بھی مونچھیں نہ نکل آئیں ۔ مگر ناصر بہت دانا میانا تھا ۔ خطرے کو بہت جلدی بھانپتا تھا اور اس کا قرار واقعی بندوبست کرتا تھا ۔ جب غزل گو بہت تنگ کرنے لگتے تو وہ لورکا کا ذکر شروع کر دیتا ۔ مگر اس سے انٹلکچوئل دوستوں کو شہ ملتی اور بادلیئر ، میلا رمے ، رمبو اور رلکے کے تذکرے شروع ہو جاتے ۔ جب بادلیئر ، میلا رمے ، رمبو اور رلکے بہت ہو جاتے اور کسی طور تھمنے میں نہ آتے تو وہ اعلان کرتا کہ شاعر تو اصل میں اسماعیل میرٹھی تھا جس نے یہ شعر کہا ہے :

کوّے ہیں سب دیکھے بھالے
چونچ بھی کالی پر بھی کالے

ادب بہت ہو جاتا تو وہ فلسفہ کی طرف جاتا اور فلسفہ بہت ہو جاتا تو وہ ''علموں بس کریں او یار'' کہتا اور دم کٹے بندروں کی باتیں شروع کر دیتا۔ ایک دفعہ اس چکر میں ناصر پر فرار کی نوبت آ گئی۔ شام پڑے قبل اس کے کہ شیخ صاحب حنیف کو لے کر ٹی ہاؤس میں داخل ہوں ناصر نے مجھے اور مشتاق کو دبوچا اور ٹی ہاؤس سے نکل چھپتا چھپاتا میٹرو میں پہنچا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے پھر میری خبر لی اور سخت غیر علمی قسم کی گفتگو شروع کر دی۔ میں نے شہ پائی اور سوال کر ڈالا کہ غالب کے یہاں عندلیب اور قمری تو ہیں مگر کیا مرغی کے بچے کا بھی ذکر ملتا ہے؟ اس پر ناصر رواں ہو گیا اور مشتاق نے جھٹ پنسل جیب سے نکال کاغذ پھیلا کر لکھنا شروع کر دیا۔ واضح ہو کہ اس زمانے میں مشتاق کی جیب سے پنسل بہت پھرتی سے نکلتی تھی۔ کبھی ناصر کی گفتگو قلم بند کرنے کے لیے، کبھی غزل لکھنے کے لیے۔ پنسل تو خیر اب بھی اس کی جیب سے اسی پھرتی ہی سے نکلتی ہے مگر اب محض اخباری بیان ڈرافٹ کرنے کے لیے۔ خیر تو یہ گفتگو قلم بند ہوئی۔ ناصر نے کہا کہ یہ ہماری ٹیبل ٹاک ہے۔ اسے چھپنا چاہیے۔ وہ ٹیبل ٹاک ''ماہِ نو'' میں چھپی اور پھر لاہور سے کراچی تک ہم پر بے بھاؤ کی پڑتی چلی گئیں۔ مگر شیخ نے اس غیر ثقہ گفتگو میں ایک علمی ثقاہت کا رنگ دیکھا۔ اس پر ہم اور شیر ہو گئے۔ پھر ٹیبل ٹاک ہوئی اور پھر ''ماہِ نو'' میں چھپی۔

خیر شیخ صاحب نے تو حوصلہ افزائی کی تھی مگر حنیف رامے کو خوب پتا تھا کہ ان ٹیبل ٹاکس میں علم کی کتنی کمی اور فلسفے کا کتنا فقدان ہے۔ پھر اس کمی کو پورا کرنے کا بہ طریقِ احسن بندوبست ہوا۔ ''سویرا'' کے دفتر میں بیٹھ کر ''خوشبو کی ہجرت'' نام والا مکالمہ ہوا جس میں شیخ صاحب، ناصر کاظمی، حنیف رامے اور اس ہیچمدان نے شرکت کی۔ اور غالب احمد اور احمد مشتاق نے ایک ایک فقرہ بول کر اس میں گراں قدر اضافہ کیا۔

وہ دن تھے جب ہماری نئی نسل تطہیر کے عمل سے گزرتے گزرتے انھیں چھ تنوں میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ان چھ میں بھی ایک کا ہونا نہ ہونا برابر تھا اس لیے کہ گھمسان کا رن تو لاہور میں پڑا ہوا تھا اور یہ چھٹا آدمی میدانِ کارزار سے دور کوہاٹ میں ہوا باز بنا بیٹھا تھا۔ مگر

فلکِ تفرقہ پرداز ان پانچ آدمیوں کو بھی اکٹھا نہ دیکھ سکا ۔ اصل میں ہماری نئی نسل کی تاریخ مسلسل خانہ جنگیوں کی تاریخ ہے ۔ بہرحال اس مرتبہ اتنا ضرور ہوا کہ گھر کے برتن باہر نہیں پھوٹے اور ہم میں سے کسی نے الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر اعلانِ بغاوت نہیں کیا ۔ کچھ یار کچھ یاروں سے خاموشی کے ساتھ الگ ہوتے چلے گئے ۔

نئی نسل بحرانی حالات سے دو چار تھی کہ ناصر کی نجی زندگی میں ایک بحران آ گیا ۔ ''ہمایوں'' دفعتاً بند ہو گیا اور ناصر بے روزگار ہو گیا ۔ ناصر کے لیے روزگار کا مسئلہ شادی کے بعد پیدا ہوا تھا ۔ ''ہمایوں'' کی ادارت نے اس مسئلہ کو اسی طرح حل کیا کہ ایک پنتھ دو کاج ۔ گھر کی دال روٹی کا بھی انتظام ہو گیا اور اپنی ادبی جنگ کے لیے بھی ایک مورچہ مل گیا ۔ ''ہمایوں'' کے بند ہونے کے بعد ناصر نے پھر ایک پنتھ دو کاج والا نسخہ برتنے کی کوشش کی ۔ سوچا کہ اپنا ادبی پرچہ نکالو کہ گھر کا چولھا بھی گرم رہے اور نئی نسل کا مورچہ بھی گرم رہے ۔ رسالے کا نام ''خیال'' تجویز ہوا ۔ یہ گویا اس ''خیال'' کی تجدید کا سامان تھا جو ۱۹۵۲ء میں نئی نسل کے طلوع کے ساتھ تین ماہ تک نکل کر بند ہو گیا تھا ۔ اب ۱۹۵۷ء تھا اور نئی نسل نئی پرانی ہو کر تتر بتر ہو چکی تھی ۔ اور اس برس کے ساتھ ایک ہی خیال ہمیں بہائے لیے جا رہا تھا ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی یاد فضا میں تیر رہی تھی ۔ پاکستان سے ہندوستان تک اس کی سو سالہ یاد منانے کے سامان تھے ۔ ہم نے اس یاد کو اپنے ادبی شعور کا حصہ جانا اور ''خیال'' کا سن ستاون نمبر نکالنے کا ڈول ڈالا ۔ اس منصوبے نے سعید محمود کے لیے قینچی کا کام کیا ۔ وہ ادب کے منطقہ سے نکل کر تاریخ کے میدان میں طرارے بھرنے لگا ۔ شہر کی ساری لائبریریوں کو کھونڈ ڈالا اور ٹی ہاؤس میں ہماری چائے کی میز پر معرکۂ ستاون سے متعلق کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ۔ اس ڈھیر کو آتے جاتے ادیب حیرت سے دیکھتے اور کہتے کہ آپ لوگ ادبی رسالہ نکال رہے ہیں یا تاریخ کا پرچہ نکال رہے ہیں ۔ سعید محمود پنجے جھاڑ کر سوال کرنے والے کے پیچھے پڑ جاتا اور ثابت کرتا کہ ادیب کے یہاں تاریخی شعور ہونا کتنا ضروری ہے ۔

تاریخ ناصر کے لیے کوئی نیا علاقہ نہیں تھی ۔ وہ پہلے بھی لین پول کے حوالے دے دے کر ہمیں تاریخ بہت سناتا رہا تھا ۔ اور لین پول کا نام

تو وہ ہمارا منہ بند کرنے کے لیے لیتا تھا - باقی تاریخ تو وہ اسی طرح پیش کرتا تھا جس طرح اس کے تخیل کی آنکھ اسے دیکھتی تھی - مگر اس کی تاریخ کے خطوں میں ۱۸۵۷ع کے معرکے کا کبھی ذکر نہیں آیا تھا - اصل میں ناصر کے تخیل کو وہ سپہ سالار زیادہ اپیل کرتے تھے جن کی فتح کا نقارہ کراں تا کراں بجتا تھا اور جو زمین کی وسعتوں پر محیط نظر آتے تھے - چنگیز خاں ، تیمور اور بابر اس کے محبوب نام تھے - ہارنے والوں میں تو وہ بس رومیل کا ذکر کرتا تھا جس کی جنگی چالوں کا اس نے ، بقول خود ، خصوصی مطالعہ کر رکھا تھا - ہم نے اس کے سامنے بخت خاں اور تانتیا توپی کے نام بہت لیے مگر وہ رواں نہیں ہوا - بس سن ستاون کے لوک گیت سنا سنا کر رہ گیا - اور کیا رواں ہوتا - سامنے تو کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا - کیا وہ جانتا نہ تھا کہ ادھر وہ تانتیا توپی پر زبان کھولے گا اور ادھر سعید محمود کتاب کھول کر بیٹھ جائے گا - ناصر تو کتاب کا حجاب ہٹ جانے کے بعد رواں ہوتا تھا - اچھا خیر ، بات یہ ہو رہی تھی کہ ناصر تو پہلے ہی سے اپنے خاص رنگ کے تاریخی شعور سے بہرہ ور تھا - اب ان چند مہینوں میں ہم لوگ بھی تاریخی شعور سے اس حد تک مالا مال ہو گئے کہ سمجھنے لگے کہ ''خیال'' کا سن ستاون نمبر ، کیا پاکستان اور کیا ہندوستان ، تمام مورخوں اور محققوں پر بھاری پڑے گا - مگر وہ تو الٹا ناصر ہی پر بھاری پڑا - ہم تو "خیال" کے ادنلی کارکن تھے - مالک اور منیجر تو ناصر تھا - اس نے ہمیں بتایا تھا کہ سرمائے کا میں نے پورا بندوبست کر لیا ہے اور پرچے کا مینجمنٹ بھی تم دیکھو گے کہ میں کیا کرتا ہوں - اور ہم نے واقعی دیکھا کہ ناصر نے پرچے کا مینجمنٹ کیا کیا - مئی کا مہینہ آ گیا - خاص نمبر نکلنے لگے - کتابیں شایع ہونے لگیں - ہم ہر نمبر اور ہر کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتے - اس کی مقبولیت پر حیران ہوتے اور ماتھا پیٹتے کہ ہمارا سن ستاون نمبر کہاں ہے - یہ مت پوچھو کہ سرمایہ کہاں کہاں سے آیا اور کتنا آیا - بس یہ جان لو کہ رسالہ لشتم پشتم جون میں کہیں باہر آیا اور مقروض ناصر کاظمی کو مزید مقروض کر گیا -

ناصر نے ہمیں یہی بتایا کہ میں بہت خط و کتابت کر رہا ہوں - بہت بلٹیاں بھیج رہا ہوں - بہت آڈر اور بہت منی آڈر آ رہے ہیں - مگر

گھر کا نقشہ چغلی کھاتا تھا کہ یہاں کوئی منی آڈر موصول نہیں ہوا ہے ۔ وہ ذخیرہ عرصے تک گھر میں رکھا رہا ۔ آخر ایک ناشر کے ہاتھ اونے پونے فروخت ہوا ۔

ناصر کے یہ دن سختی کے دن تھے ۔ مگر انھیں سختی کے دنوں میں اس نے ایک خرچ اور بڑھا لیا ۔ چائے ، سگریٹ اور پان کے ساتھ ساتھ اب سواری نے بھی ناصر کی زندگی میں راہ پا لی ۔ وہ دور اب ختم ہو چکا تھا جب ناصر گھر سے پیدل نکل کر پیدل ہی گھر واپس جاتا تھا ۔ اب صورت یہ تھی کہ ناصر پرانی انارکلی سے کرشن نگر منتقل ہو چکا تھا اور ازدواجی زندگی کی بدولت اسے رات ہی کے کسی حصے میں گھر بھی واپس جانا ہوتا تھا ۔ اب یا تو دوست گھر تک ناصر کو چھوڑ کر آئیں یا پھر سواری ہونی چاہیے ۔ گھر پہچانے والوں کو اس کا خوب تجربہ تھا کہ ناصر گھر کے دروازے پر پہنچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ گھر پہنچ گیا ہے ۔ پھر وہ دروازے پہ کھڑے کھڑے بات کو اتنا طول بھی دے سکتا ہے کہ صبح کی اذان ہو جائے اور چڑیاں بولنے لگیں ۔ یہ مسئلہ روز رات کو واپسی کے سمے پیدا ہوتا تھا ۔ مگر رفتہ رفتہ یہ مسئلہ نہایت خوبصورتی سے حل ہوا ۔ ٹولنٹن مارکیٹ کے پاس پہنچ کر ناصر وہاں برآمدے میں بیٹھے ہوئے پنواڑی سے پان کھاتا ، سگریٹ لیتا اور پھر قریب کھڑے ہوئے تانگے میں بیٹھ کر ہمیں آخری سلام کرتا اور رخصت ہو جاتا ۔ پہلے تو ہمیں کچھ پتا نہ چلا کہ بھید کیا ہے ۔ پھر رفتہ رفتہ پتا چلا کہ ایک تانگے والا ناصر کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو چکا ہے ۔

بعض ترقی پسندوں کو ناصر کے گزر جانے کے بعد یہ پتا چلا ہے کہ ناصر تو عوام کے دکھ درد سے بھی آشنا تھا ۔ "دیوان" کی جن غزلوں نے ان سادہ دل ترقی پسندوں کو ورطۂ حیرت میں غرق کر رکھا ہے وہ ان یاروں کے لیے حیرت انگیز نہیں ہو سکتیں جنھوں نے گرم و سرد راتوں میں ناصر کو خاک نشینوں اور گدڑی پوشوں سے گھلتے ملتے دیکھا ہے ۔ یہ گھلنا ملنا کسی نظریے کے واسطے سے نہیں تھا ۔ اور نظریے کے واسطے سے گھلنے ملنے کی منزل تو کم ہی کم آتی ہے ۔ دور ہی دور سے اظہارِ محبت ہوتا ہے ، درمیانی فاصلہ طے نہیں ہوتا ۔ درمیان میں یہ سوال آ جاتا ہے کہ اپنے آپ کو de-class کیسے کریں ۔ ناصر کا طور ہم نے یہ دیکھا کہ

ایک سطح پر وہ طبقۂ اشراف کی خُو بُو رکھتا تھا۔ زندگی کیسی بھی گزرتی ہو مگر دماغ ویسے ہی تھا اور ٹھسّا وہی تھا۔ مگر دوسری سطح پر اس نے اپنے آپ کو بلاتکلف de-class کر لیا تھا۔ یوں دیکھو تو ناصر بس کی سواری کے سخت خلاف تھا۔ جب کبھی اس سے بس میں بیٹھنے کو کہا جاتا تو سخت بے مزہ ہوتا۔ منہ بگاڑ کر کہتا کہ بس میں ہر قسم کا آدمی بھرا رہتا ہے۔ ہر ایک سے کندھا ملانا پڑتا ہے۔ پھر اپنا کوئی ناخوش گوار سا تجربہ سناتا کہ فلاں دن میں گھر سے سفید براق قمیص اور استری کیا ہوا پتلون پہن کر نکلا تھا۔ شامت جو آئی تو بس میں بیٹھ گیا۔ ایک میلا آدمی میرے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ قمیص میلی ہو گئی اور پتلون کی کریز کا ستیاناس ہو گیا۔ عجب بات ہے کہ ناصر کو آگے پیچھے کبھی اپنی قمیص کے اجلے میلے ہونے کا اور پتلون کی کریز کا احساس نہیں ہوا۔ یہ دھیان اسے بس کی سواری کے حوالے ہی سے آتا تھا۔

یہ دن کا ذکر تھا۔ رات کو شہر کا نقشہ اور ہوتا تھا اور ناصر بھی اور ہوتا تھا۔ آدھی رات ہوتے ہوتے سفید پوشوں کے ہوٹل اور ریستوراں بند ہو جاتے۔ دوکانیں بند بازار خالی۔ فٹ پاتھوں کا نقشہ یہ نظر آتا کہ جہاں تہاں کوئی گدڑی پوش گٹھڑی مارے پڑا ہے یا گھٹنوں میں سر دیئے خاموش بیٹھا ہے۔ کسی نکڑ پہ کسی بوڑھے قسمت کے مارے پنواڑی نے اپنی بساط جما رکھی ہے۔ کسی کھمبے تلے فٹ پاتھ پہ چائے کی دوکان جمی ہے۔ اس خاک میں رلی ملی مخلوق سے ناصر کا جیتا جاگتا تعلق تھا۔ اس مخلوق میں ہر قماش کے آدمی سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔ کوئی چرب زبان کہ ایک فقرہ ناصر نے کہا، آگے سے اس نے کوئی چمکتا ہوا سا فقرہ کہہ ڈالا۔ کوئی اچھی خاصی تقریر شروع کر دیتا۔ کوئی بد مزاج دنیا جہان سے بیزار کہ ناصر نے میٹھی سی بات کی اور کڑوا جواب پایا۔ کوئی غریب مسکین گم سم کہ ناصر بولے جا رہا ہے مگر کیا مجال کہ ادھر سے کوئی جواب آئے۔ مگر ناصر کے پاس ان میں سے ہر آدمی کی کل موجود تھی۔ ہر مزاج کے خاک نشین کو ٹوہتا پھرتا اور اس طرح کلام شروع کرتا کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے غیریت کے پردے اٹھ جاتے اور خلوص قایم ہو جاتا۔ ان میں سے پنواڑیوں کے ساتھ ناصر کا حساب بہت چلتا تھا۔ پتا نہیں لین دین کی کیا صورت تھی۔ مگر ہر دوکان پر کھڑے ہو کر احساس یہی ہوتا تھا

کہ یہاں اسے مخصوص مراعات حاصل ہیں ۔

جس تانگے والے کا میں نے ابھی ذکر کیا وہ بہت کم گو تھا ۔ رات کی کون سی گھڑی میں کیا داستان سن کر ناصر کا گرویدہ ہوا ، یہ تو مجھے معلوم نہیں ۔ ہاں یہ دیکھا کہ ادھر رات کا ایک بجا اور آدھر وہ سواریاں ڈھو ڈھا کر ٹولنٹن مارکیٹ کے سامنے آ پہنچا ۔ پان والے سے پوچھا "کاظمی جی آئے ۔" — "نہیں" پان والے نے جواب دیا ۔ اس جواب سے مطمئن ہو کر وہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر لیٹ کر اونگھنے لگتا ۔ ہم پھر پھرا کر کبھی ڈیڑھ بجے یہاں پہنچتے ، کبھی دو بجے ، کبھی تین بجے ۔ وہ بہرحال انتظار کرتا اور اس دوران میں اگر کوئی سواری آتی تو اسے انکار کر دیتا ۔ سود و زیاں سے بے نیاز یہ تانگے والا مہینوں اس طور ناصر کی تابع داری کرتا رہا حتٰی کہ اس کا ایک رقیب پیدا ہوگیا ۔ اصل میں یہ ایسا زمانہ تھا جب ابھی لاہور کی نمایندہ سواری تانگہ ہی چلی آ رہی تھی ۔ ابھی موٹر ٹیکسی اور رکشا نے زور نہیں باندھا تھا اور تانگے پر مسال کا رستہ بند نہیں ہوا تھا ۔ اس سڑک کے مختلف اڈوں پر رات گئے کھڑے ہونے والے تانگہ بان ہمیں پہچانتے تھے اور ہم انہیں پہچانتے تھے ۔ انہیں میں لئیق تانگے والا بھی تھا جس نے پہلے مجھے اپنی اس گھوڑی کی سہات سنائیں جو نور کے تڑکے دلی سے چلی اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میرٹھ کی نوچندی میں داخل ہوئی ۔ پھر اس نے جن اور عورت کو ہرانے کے اپنے محیرالعقول قصے سنائے ۔ مگر ایسا آدمی مجھ خاموش سامع پر زیادہ دن قناعت نہیں کر سکتا تھا ۔ اس نے بالآخر ناصر کو تاڑا اور ٹولنٹن مارکیٹ پر کھڑے ہونے والے تانگے والے سے اسے اچک لیا ۔ ولی را ولی می شناسد ۔ دونوں نے ایک دوسرے کی پروازِ تخیل کو دیکھا اور دوست بن گئے ۔

عورت اور جن کو قابو میں لانے والا اب ناصر کے قابو میں تھا ۔ جب ہم بارہ بجے کے لگ بھگ لارڈز سے نکلتے تو بس وہیں کہیں لئیق مل جاتا ۔ مگر ناصر یہ تو نہیں کر سکتا تھا کہ چائے خانے سے نکل کر فوراً تانگہ میں بیٹھ کر گھر چلا جائے ۔ اسے پیدل چل کر بھی تو بہت سی باتیں کرنی ہوتی تھیں ۔ سو لئیق سے کہا جاتا کہ تم فلاں نکڑ پہ پہنچ کر ہمارا انتظار کرو ۔ پیدل چلتے ، باتیں کرتے ، ہم کسی نہ کسی طور اس نکڑ پہ پہنچتے ، تانگے میں بیٹھتے ، پھر کرشن نگر کی طرف روانگی ہوتی ۔ لئیق

کو انتظار کی ایک مدت گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر بھی گزارنی ہوتی تھی - آخر یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ ناصر تانگہ سے اتر کر اکیلا گلی میں چل کر گھر جائے - اور میرے ساتھ جانے کا مطلب تھا مزید گفتگو - ناصر کا کیا اعتبار ، ڈیوڑھی میں قدم رکھتے رکھتے کوئی نئی داستان شروع کر دے - لئیق کو بہرحال میری واپسی کا انتظار کرنا ہوتا تھا - ایک روز ناصر نے لئیق سے کہا کہ یار تم یہاں اکیلے کیا کرو گے - چلو ساتھ - لئیق اپنا چابک لیے ہمارے ساتھ ساتھ چلا - کمرہ کھولا گیا - بھابی کو اٹھا کر چائے بنوائی گئی - پھر شاعری کے بارے میں ایک لمبی گفتگو ہوئی - اور لئیق نے اتنی یکسوئی سے ساری گفتگو سنی جیسے اس نے شاعری کا ہر نکتہ اور ہر رمز سمجھ لی ہے -

لئیق کے اور ہمارے درمیان پہلے مال روڈ حائل ہوئی ، پھر نئی سواریاں حائل ہوگئیں - مال روڈ تانگوں پر بند ہوگئی - اب لئیق کو عقبی سڑکوں کے چکر کاٹ کر ہمارا تعاقب کرنا پڑتا تھا - پھر ہماری زندگی میں ایک موٹر نے راہ پا لی - ادھر مال پر رکشاؤں کا زور بندھتا چلا گیا - لئیق نے ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ چاہے میں بھوکا مر جاؤں ، مگر تانگہ چھوڑ کر رکشا اور ٹیکسی نہیں چلاؤں گا - ہاں کوئی اور کاروبار کر سکا تو کر لوں گا - لئیق نے اپنے وعدے کو نبھایا اور رکشا ٹیکسی سے ہزیمت اٹھا کر تانگہ چھوڑا تو کبابوں کی دوکان کھول لی - ہم اپنی وضع کو قایم نہ رکھ سکے - تانگے کی سواری چھٹی تو پھر سواری کا امتیاز ہی ختم ہوگیا -

یہ ہمارے رتجگوں کا دورِ آخر تھا - ٹی ہاؤس کو احمد مشتاق کے سپرد کرکے ہم لارڈز ریستوران میں آ بیٹھے تھے - ایک وقت تھا کہ ناصر مشتاق کے پنجے کی بہت تعریف کرتا تھا - مشتاق ہر اپنے پرائے کو پنجہ مارتا تھا اور ناصر داد دیتا تھا - مگر مشتاق کے ناخن تیز ہوتے چلے گئے کہ خود ناصر کو اس پنجے سے شکایت رہنے لگی - ان حالات میں یاروں نے ٹی ہاؤس سے ہجرت کی اور لارڈز ریستوراں میں چار گھائل آدمی اکٹھے ہوئے - ناصر ، سجاد باقر رضوی ، منیر احمد شیخ ، میں - اس ٹولی کے پیچھے پیچھے دانشوروں کی کچھ اور ٹولیاں یہاں آ کر آباد ہو گئیں - لارڈز میں چند دن خوب چھل پہل رہی - مگر پھر جنگِ ستمبر آ گئی - محفل ختم رتجگے معدوم -

جنگ تو آندھی تھی کہ آئی اور گزر گئی ۔ مگر اس کے بعد امن کے دن تو واپس آ گئے ۔ ہماری راتیں واپس نہ آ سکیں ۔ اعلانِ تاشقند ہوا تو ہم یاروں نے بھی اپنے اپنے طور پر اعلانِ تاشقند کیا ۔ آوارگی کا دور ختم ۔ ایک نے شادی کی ، پھر دوسرے نے شادی کی ، پھر تیسرے نے شادی کی ۔ ناصر نے ہر شادی میں کم و بیش باپ والا کردار ادا کیا ۔ ہنسی خوشی دوستوں کے سہرا باندھا ۔ پھر اداس ہوگیا ۔

پھر ناصر تنہا ہوتا چلا گیا ۔ میر کا یہ شعر ناصر نے بہت پہلے سے گنگنانا شروع کر دیا تھا :

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

مگر اب واقعی وہ وقت آ چکا تھا کہ جن جن کو عشق کا آزار تھا وہ اس آزار سے فارغ ہو چکے تھے ۔ محفل برہم ہو چکی تھی ۔ رتجگے تتر بتر تھے ۔ اب اکیلا ناصر تھا اور اداس راتیں تھیں ۔ ناصر جب پہلے پہل مجھے پت جھڑ کی دوپہر میں ملا تھا تو وہ تنہا نظر آتا تھا مگر تنہا نہیں تھا ۔ دوستوں کی ایک ڈار تھی کہ دن اور رات کے ہر پہر میں اس کے ساتھ چلتی تھی ۔ مگر اب ڈار بکھر چکی تھی اور زخمی ہرن اپنے درد کے ساتھ اکیلا بھٹکتا پھر رہا تھا :

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے\
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

ہم سبو گھر سے نکلتے ہی نہیں اب ناصر\
میکدہ رات گئے اب بھی کھلا ہوتا ہے

ویسے ناصر کو خوب پتا تھا کہ میکدے بھلے ہی رات گئے کھلے رہتے ہوں مگر راتیں اب ویسی نہیں رہی ہیں ۔ وہ راتیں اور تھیں جب ہم سب اکھٹے رات رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے اور ناصر بتایا کرتا تھا کہ رات کا وقت ہی اصل میں تخلیق کا وقت ہے کہ کائنات رات ہی کو تخلیق ہوئی تھی ۔ وہ ہماری نسل کی بہترین تخلیقی راتیں تھیں اور شاید پاکستان کی بھی ۔ پچھلے پہر کے خاموش اندھیرے رستوں پر چلتے ہوئے لگتا کہ کائنات نئے سرے سے تخلیق ہو رہی ہے ، ہمارے لیے اور اس پوری

خلقت کے لیے جو صدیوں کی بے آرامی کے بعد سکھ کی نیند کے خواب دیکھ رہی ہے ۔ ناصر ایک استغراق کے ساتھ رات کی حمد و ثنا کر رہا تھا ۔ خود جاگتا تھا اور بے آرام خلقت کو لوری دیتا تھا ۔ لیکن ایک رات ناصر نے اپنے تازہ شعر سنائے :

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشی آواز نما کچھ کہتی ہے

اور ہمیں لگا کہ ہماری راتوں میں ایک درہمی سی آ گئی ہے اور کائنات جیسے بنتے بنتے بیچ میں رہ گئی ہو ۔ یہ ۱۹۵۸ع کی ان کالی راتوں میں سے ایک رات تھی جنھیں مارشل لا نے آ لیا تھا ۔ ہمارا قافلہ اس وقت خاموش میکلوڈ روڈ پر بھٹک رہا تھا ۔ اور آج ہمیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ زیادہ رات تک باہر نہیں رہنا چاہیے ۔

ناصر کے وجدان نے جو بتایا تھا وہ پورا ہوتا چلا گیا ۔ ہماری راتوں کے بیچ درہمی بڑھتی چلی گئی ۔ رات کا وہ جادو جو ناصر کی معرفت ہم پر منکشف ہوا تھا زائل ہو چلا تھا ۔ اب رات کی تہہ میں خوف کی ایک مبہم سی اور سرسراتی موجودگی محسوس ہوتی تھی ۔ ناصر نے رات کی حمد و ثنا ترک کر دی تھی ۔ اب اس کے یہاں رات کے بیان نے یہ رنگ اختیار کر لیا تھا :

کیسی اندھیری رات ہے دیکھو
اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے

✶

بازار بند ، راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

گلیوں میں اب تو شام سے پھرتے ہیں پہرہ دار
ہے کوئی کوئی شمع سو وہ بھی بجھی ہوئی

ہماری راتیں زوال کرتی چلی گئیں اور ناصر کے رتجگے پریشان ہوتے

چلے گئے ۔ آخر انھوں نے یہ رنگ پکڑا :

یہ کالے کوس کی پرہول رات ہے ساتھی
کہیں اماں نہ ملے گی تجھے کنارے پر
صدائیں آتی ہیں اجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر

ناصر کے یہاں یہ رات کا آخری بیان ہے ۔ اور اب ناصر کی صبح بھی آس پاس ہی تھی ۔ اس کنارے گولی چل رہی تھی اور اس کنارے ناصر ہسپتال میں پڑا تھا ۔ یہ دونوں واقعے اس طرح آگے پیچھے گزرے ہیں کہ میں انھیں اپنے ذہن میں الگ الگ نہیں کر سکتا ۔ نہیں ، مجھے یوں کہنا چاہیے کہ میں نے پاکستان کو اور ناصر کو ساتھ ساتھ آفتاب کی طرح چڑھتے دیکھا اور ساتھ ساتھ چاند طرح گہناتے دیکھا ۔ اب میں ان دونوں وارداتوں کو اپنے ذہن میں الگ الگ نہیں رکھ سکتا ۔ وہ محرم کے دن تھے کہ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ خبر سنی کہ جس دن پر سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں وہ ملتوی ہوگیا اور ڈھاکہ میں ہنگامہ شروع ہوگیا ۔ اور عاشورہ کے آتے آتے دیکھا کہ ناصر نے خون کی قے کی اور ہسپتال پہنچ گیا ۔ ناصر کہیں ۱۹۵۹ع میں رائٹرز گلڈ کے ایک ادبی وفد کے ساتھ مشرقی پاکستان گیا تھا ۔ دوسرے ادیب وہاں سے رشوگلے اور جھرنا کی باتیں کرتے آئے ۔ ناصر نے آ کر ہمیں اور اور قسم کی داستانیں سنائیں ۔ سٹوپا ، مہنت ، مہاتما بدھ ، دھان کے کھیت ۔ سبز جھیلوں میں تیرتا چاند اور ہلکورے لیتی کشتی اور بھٹیالی ۔ ٹھنڈی رات جزیروں کی ۔ جنت ماہی گیروں کی ۔ چکمہ قبیلے کے لوگ ۔ اور وہ آدمی جس کا باپ مکھی بن گیا تھا ۔ "یار وہ مجھ سے کہنے لگا کہ میرا باپ مکھی تھا ۔ میں نے تعجب سے کہا کہ مکھی ۔ اس نے کہا کہ ہاں مکھی ۔ وہ مکھی بن گیا تھا ۔ میں نے پوچھا کہ مکھی کیسے بن گیا ۔ کہنے لگا کہ میری ماں بتاتی ہے کہ میں دیکھتی رہ گئی ۔ وہ بس ایک ساتھ مکھی بن گیا ۔" مگر اب ناصر کے لیے اس داستان سے حیرت کی کیفیت رخصت ہو گئی تھی ۔ اب ان سارے منظروں کے گرد دہشت منڈلا رہی تھی ۔ آدمی مکھیوں کی

طرح مر رہے تھے :

کشتیوں کی لاشوں پر
جمگھٹا ہے چیلوں کا

ناصر بظاہر شفا یاب ہو کر ہسپتال سے نکلا ۔ مگر جنگ کے آس پاس کے دنوں میں پھر ہسپتال پہنچ گیا ۔ جنگ کے آتے آتے وہ گھر آ گیا ۔ میں نے اس سے کہا کہ آج کل موٹروں کا رخ شہر سے باہر کی طرف ہے ۔ اس نے فوراً دور کی لی ''ہاں کل میرا ایک مداح موٹر لے کر گھر آن پہنچا تھا کہ ناصر صاحب یہ موٹر حاضر ہے ۔ آپ میرے ساتھ چلیں ۔ میں نے کہا کہ میں تو شہر نہیں چھوڑوں گا ۔ ہاں میرے کبوتروں کو لے جاؤ ۔ وہ سوچ میں پڑ گیا ۔ مگر خیر پھر وہ آمادہ ہو گیا ۔''

''پھر ؟'' میں نے پوچھا ۔

''پھر یار میں نے سوچا کہ لاہور اس وقت خطرے میں ہے ۔ اس کے محافظوں کو یہیں رہنا چاہیے ۔''

اس جنگ نے ناصر کے منتشر رتجگوں کو مزید منتشر کیا ۔ خیر جنگ سے ہم جلدی ہی فارغ ہو گئے ۔ جنگ سے بھی اور سبز جھیلوں کے دیس سے بھی ۔ اس فراغت میں ناصر پھر ہسپتال جا پہنچا اور اس مرتبہ ہسپتال میں ایسا گیا کہ راتوں سے اس کا رشتہ بالکل منقطع ہو گیا ۔ پچھلی دونوں مرتبہ اس نے راتوں سے اپنا رشتہ کسی نہ کسی طور برقرار رکھا تھا اور رتجگے کی ریت کو اچھا خاصا نبھایا تھا ۔ ہم چند دوستوں کو دوسروں کو یہ باور کرانے میں کہ ناصر واقعی بیمار ہے بہت دقت پیش آئی ۔

''یار کیوں مذاق کرتے ہو ؟''

''مذاق نہیں ۔ وہ ہسپتال میں پڑا ہے ۔''

''ہسپتال میں ؟ اسے تو میں نے رات گئے میکلوڈ روڈ پر گھومتے دیکھا تھا ۔''

ناصر نے اپنی بیماری میں ہسپتال کے چند ڈاکٹروں کو بھی تو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا ۔ شاید اسی سے فائدہ اٹھا کر وہ کبھی شام پڑے کبھی رات گئے اپنے کمرے میں تالا ڈالتا اور رات سے ملاقات کے لیے نکل جاتا ۔

مگر تیسری مرتبہ جب وہ ہسپتال میں گیا تو رات سے ملاقات کی سکت اس میں نہیں رہی تھی - اور اب رات کا رنگ بھی تو اور سے اور ہو چکا تھا :

صدائیں آتی ہیں اُجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر

ٹھنڈی راتوں والے جزیرے اُجڑ چکے تھے - اب کوئی اور جزیرہ ناصر کو پکار رہا تھا - اور ناصر شاید عاشور کے گزرنے ہی کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کے گزرتے ہی حالت بگڑتی چلی گئی - وہ محرم کی ایک رات تھی - چاند نکلا ہوا تھا اور ناصر پار اُترنے کی تیاری کر رہا تھا - نیم غشی کا عالم تھا اور بکھری یادوں کا ہجوم تھا - کوئی یہاں کی بات کوئی وہاں کی بات - اور لبوں پر اپنا ہی ایک شعر :

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے

رات اسی عالم میں کٹی - صبح ہونے پہ چڑیا کی پہلی آواز کے ساتھ آنکھیں مندنے لگیں - اسی طرح جس طرح رتجگے کے بعد وہ کسی چائے خانے میں بیٹھا ہوا پہلے پہل جاگنے والی چڑیا کی آواز پر پہلے چپ اور افسردہ ہوتا اور پھر اسے نیند آ جاتی - اب صبح ہو رہی تھی اور ناصر سو رہا تھا - یعنی :

رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

* * *

اجنبی شہر کی تلاش

صلاح الدین محمود

انیس سو پچپن عیسوی کی گرمیوں کا عمل تھا اور میں علی گڑھ سے، چند ماہ گزارنے، لاہور کی دہلیز تک آیا ہوا تھا کہ میرے بچپن کے ایک دوست، محمد سلیم الرحمٰن، جو کہ لاہور میں چند برس پہلے سے قائم تھے، ایک شام میرے پاس آئے اور اپنی مثالی فراخ دلی سے کہا۔

"چلو کہیں چل کر چائے پلاؤ ——"

میں لاہور میں بالکل تازہ تھا اور اب تلک اپنے گھر کے بلند درختوں سے باغِ جناح کی نیلی ہریاول کے سکوت تک صرف ایک ہی راستہ جانتا تھا۔ اپنے اس دوست کی خواہش کو میں نے رد نہ کیا تھا اور یہ مجھ کو چند پیچیدہ اور تنگ گلیوں اور پھر تانگوں کے ایک جھنڈ سے گزار کر ایک چائے خانے کی کگر تک لے آئے تھے اور پھر چائے کی آمد تک اپنے دماغ کے کسی چیدہ کھوکھن دانے کی نظر ہو گئے تھے۔

میں اب اکیلا تھا اور اس نئے شہر کے ساتھ پاکی اور بھول پن کا یہ میرا آخری لمحہ تھا۔

کسی شہر میں اول اول اجنبی ہونا بہشت کا ایک پہلو ضرور ہے اور شاید ہماری جنت کے درجات میں ایک مقام ایسا بھی آئے گا کہ جہاں کچھ نیک بندوں کو، ان کی پسند کے شہر میں، ہمیشہ اجنبی رکھا جائے گا۔

کاش ہماری نیکیاں اس قماش کی ہوں۔

مگر فی الحال تو میں اس جہاں ہی میں تھا۔ سو جب یہ لمحہ بیت چکا تھا تو کچھ اصحاب ہماری میز کی جانب آئے تھے اور اپنی دانست میں، ہمارے گرد، فرار کی تمام راہیں تھام کر بیٹھ گئے تھے اور گفتگو کا

آغاز پھر وہیں سے کیا تھا کہ جہاں ، اس سے پہلی میز پر ، اس کا جائز اختتام ہو چکا تھا ۔

میں چائے خانوں سے بالکل ہی ناواقف نہ تھا مگر اس خانے کا دستور و عمل کچھ انوکھا اور نیا تھا ۔ دو ٹولیاں تھیں کہ ایک اپنے کو خود ہی ، اپنی زبان سے ، پختہ گردان رہی تھی اور دوسری کو اپنی ناپختگی پر ناز تھا ۔ پھر چند لمحہ بعد یہ عمل دیکھا کہ یہ خود ساختہ پختہ حضرات غیر پختہ حضرات کو پختہ اور غیر پختہ حضرات پختہ حضرات کو غیر پختہ بنانے پر مصر ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ اپنی ماندہ زندگیاں اس عمل کے واسطے وقف بھی کر چکے ہیں ۔

اب ذرا منظر چھٹا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ کچھ چہرے ہیں کہ بے آواز ہیں اور کچھ آوازیں ہیں کہ ان کے چہرے عرصۂ صوت ہوا بیت چکے ۔کہ کچھ جسم ہیں کہ بالباس ضرور ہیں اور کچھ لباس ہیں کہ ان کے اسم ان سے موقوف و مفرور ہیں ۔ یہاں نہ تو گوش کو بینائی میسر ہے اور نہ آنکھ کو شنوائی ۔ پس کچھ قدم ہیں کہ جن کے بدن نہیں اور اگر بدن بولتے ہیں تو بے قدم ہیں ۔

کچھ محض نیتیں ہیں اور کچھ نیتیں تک نہیں ——

یک بیک مجھ کو اپنے سامنے اور اردگرد ایک غیر سمت کا احساس ہوا تھا کہ جس کے میدان میں ایک غیر خلقت بستی ہو اور جہاں کا ہر شجر غیر شجر ہو —— یہ شجر گھنا ضرور ہو مگر اس کا پھل کسی اگلے جنم کے موسم میں آن کر بیت چکا ہو اور اب محض اس درخت کا فرض اتنا ہو کہ اپنی اناتھ شاخوں سے چھن کر آتی روشنی کو ساکن میدان پر لائے کہ جہاں ازل و سکوت ، صوت اور موت ، فرمان اور ارمان کا یہ جال ہر دم بنتا اور ہر دم موقوف ہوتا جائے ۔ بدلتے پہلوؤں کا یہ سبک جال جاذب ضرور تھا اور حرف کے سیاح جو اس میدان میں بھٹک آتے تھے اس کی گرفت ضرور پاتے تھے ۔ بھلا ان کو کون بتانے والا تھا کہ اس سمت غیر سمت کا عمل ہے کہ یہ شجر غیر کا لمحۂ نظر ہے کہ اس میدان میں ایک غیر خلقت نے اپنا فرمان بچھایا ہوا ہے ۔

سو خالص حرف کا معصوم و مہکتا سیاح یہاں آتا تھا اور ان تھمتے بکھرتے چپوں کی تھام میں آ کر سوداگر بن جاتا تھا ۔

اور رہا حرف —— تو وہ ایک بار پھر ناپید ہو جاتا تھا ——

سو چائے خانے میں ہم خاموش تھے اور چہار جانب چائے کا خمار بولتا تھا -

سورج کی روشنی بلند کھڑکیوں اور زیادہ بلند روشن دانوں سے فرش کی جانب بکھرتی تھی اور فرش و میز ، پر گو اور کم آمیز پر داغ چھوڑتی اور گزر جاتی تھی - دروازہ کھلتا اور بند ہوتا تھا - لوگ آتے گفتگو فرماتے اور پھر موقوف ہو جاتے تھے کہ کوئی ایک سو ایک ویں بار دروازہ پھر کھلا اور ہم نے دیکھا کہ سیاہ مائل جسم پر سپید مائل لباس سنبھالے ، اپنے شانے سے روشنی کا داغ جھٹکتا ، ایک آدمی داخل ہوا اور ، بن بلائے ، نہایت اطمینان سے ہمارے ساتھ آن بیٹھا -

"یہ ناصر کاظمی ہیں -"

"بہت خوب - میں صلاح الدین محمود ہوں -"

"بہت خوب -"

"آپ چائے پیئیں گے -"

"جی ہاں ضرور - مگر میں بیمار ہوں -"

یک دم مجھ کو یہ انسان پسند آیا تھا - مجھ کو احساس تھا کہ جو میدان یہ شخص اپنے ساتھ لایا ہے وہ میرے اپنے میدان سے بہت مختلف ضرور ہے - ہم نے علی گڑھ کے میدانوں میں ، ہواؤں سے ، اپنی جوانی کی شرط باندھ کر ، دوڑیں کی تھیں اور دور کے ساکت شجر کو ان سے پہلے جا لیا تھا - مگر ، اس کے برعکس ، ناصر کا میدان ایسے در و دیوار کا میدان تھا کہ جس کے طاق و دریچے ، صحن و گلیاں ، ہوا کی سمت کھلے ، ہوا کا انتظار کرتے تھے - اس اختلاف کے باوجود یا شاید اسی واسطے سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا - دوست تو بہرحال وہ انسان ہے کہ جس کو اچھی طرح سے جان جانے کے باوجود ہم پسند کرتے ہیں اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اس اختلاف سے بہتر ، گہری اور دیر پا ، دوستی کی کوئی اور بنیاد شاید نہیں -

مگر ان حالات میں دونوں جانب سے دماغ کی رحمت لازم ضرور آتی ہے -

سو وہ دوپہر یوں گزری تھی اور جب دھوپ کچھ چھٹی تھی تو میں اور میرے دوست محمد سلیم الرحمٰن چائے خانے سے فرار پا کر واپس ہوئے تھے۔ سلیم اپنا فرض ادا کرکے جدا ہوئے تھے اور میں تانگوں کے جھنڈ کو پار کرکے اس نئے راستے کی تنگ و تاریک گلیوں سے اپنے گھر کو واپس ہوا تھا۔

چلتے وقت ناصر نے ہماری دوستی کا پہلا اور آخری مشورہ مجھ کو دیا تھا۔

"آپ اس شہر میں اجنبی ہی رہیں تو بہتر ہے ورنہ کہیں یہ دماغ کی مہک ضائع نہ ہو جائے۔"

"مگر آپ" میں نے کہا تھا ــــ

"جو مشورہ میں آپ کو آج دیتا ہوں کاش دس برس پہلے میرے کسی دوست نے مجھ کو دیا ہوتا۔"

*

پھر کچھ عرصے بعد میں سات سمندروں کے پار ایک دریا کو چھو دیکھنے چلا گیا تھا۔ یہ وہی دریا تھا کہ جس کے کنارے اپنی کھڑکی کے پرے، ایک رات، میں ہر چیز کو خاک چھوڑ کے سویا تھا اور صبح سپید پایا تھا۔ سپید جیسے بہتی شبنم کا رنگ ہو۔ سو، بے اختیار، میں نے اس بہتے دریا کو چھو دیکھا تھا اور وہ چھو دیکھا دریا مجھ کو پا کر ایک سمندر کے چراغ میں بہا لایا تھا۔

یہ ایک ایسا سمندر تھا کہ جیسے سدا چراغ کی لو ہو اور اس لو کا بہاؤ صرف میرے واسطے تھا۔

تین برس اس سمندر میں بیت گئے تھے۔

انسان کہتا ہے کہ دیکھو وقت گزر جاتا ہے۔ مگر کوئی وقت کی بھی تو سنے کہ جو قائم رہتا ہے اور ہمیشہ کہتا ہے "یہ انسان کو چند لمحات میں کیا ہو جاتا ہے۔"

سو پھر ان لمحات کے بعد جب اس ساگر کی تھام سے میں اپنے ساحل واپس آیا تھا تو جہاں اپنے لہو اور اپنی خاک کے واسطے اور کچھ پایا تھا وہاں ، حسبِ دستور ، اپنے چند دوستوں کے لیے کچھ "تحائف" بھی لایا تھا ۔

اس دوران مجھے ناصر کی تلاش کے بارے میں علم تھا ۔ مجھ کو علم تھا کہ وہ اپنے شہر اور اپنے درمیان کھوئی اجنبیت کو بحال کرنے میں محو ہے ۔ تاکہ ہوائیں پھر اس کے بنائے در و دیوار کے ہم سمت چل سکیں ۔

مجھ کو اپنے سفر کے دوران ، مصر میں ، اسکندریہ کے جدید یونانی شاعر قسطنطون قوافی کی ایک نظم دست یاب ہوئی تھی ۔ اس نظم کا عنوان "شہر" تھا اور اپنی واپسی پر میں نے اس نظم کا ترجمہ ، اردو زبان میں کرکے ، ناصر کاظمی کو سنایا تھا ۔

قوافی کی نظم کا ترجمہ یوں تھا :

تم نے کہا :
"میں کسی اور زمیں ، کسی اور سمندر کو چلا جاؤں گا ،
کوئی اور شہر اس شہر سے بہتر پاؤں گا ۔
میرا حشر یہاں کہ مجھ کو ہر ایک عیب ملا ،
میرا قلب کہ جیسے زمیں کے بن میں تن مردہ ۔
میرے ذہن میں کب تک قائم رہے گا اندھیرا ؟
ہر سمت مڑے میں جس کو دیکھوں چاہے جہاں ،
میں سیاہ سے پاؤں اپنے تن کے جلے نشاں ۔
یہاں برسوں میں نے صرف کیے اور تلف کیے
اور جان کے ہر ذرے میں پیدا دشت کیے ۔"

"تمھیں نہ ہوگا
اب نئے جہاں اور نئے سمندر کا امکاں ۔
یہ شہر ہمیشہ پیچھے پیچھے جائے گا ،
تم بھٹکو گے ان ہی سڑکوں پر ، ان ہی دیواروں کے اندر
عمر کا کتبہ لہو کے اندر آئے گا ۔

حتیٰ کہ ان ہی گھروں میں آخر کو ،
جب بال تمھارے بنیں گے لو
تم سدا یہیں کو پہنچو گے ، اب بھاگ کی خواہش نہ رکھو :
کوئی کشتی نہیں تمھارے کو ، کوئی راہ کہیں کو نہ جائے ہے
جیسا کہ تم نے اس گوشے میں اپنی جان کو تلف کیا ،
اس ہی لمحے
اس خاک کے ہر ہر ذرے میں
تم نے اپنے کو دشت کیا ۔"

ناصر کاظمی کو شاعر اور شاعری ، دوست اور دوستی ، طلب و تلاش پر اتنا اعتماد تھا کہ بارہ برس پہلے جب اس نے قوافی کی اس نظم کا یہ ترجمہ سنا تھا تو وہ آنسو لایا تھا اور اس نے کہا تھا :

"اچھا تو پھر اب کیا کریں ؟"

میں نے مشورہ اسی راستے کا دیا تھا کہ جس کا برسوں پہلے سے وہ ہم قدم تھا ۔ "ناصر اگر اس شہر سے نجات نہیں تو دوبارہ اس شہر کا ازل دریافت کرو ۔"

ناصر کاظمی کا شہر کی بنیاد اور پھر اس کے ساتھ پہلا لمحہ دریافت کرنے کا عمل ایک انوکھا عمل تھا ۔ یہ پان فروشوں سے دوستی اور ان سے ماہ تیس کے بارے میں سرگوشیاں ۔ یہ تانگے والوں کو بیدل کا مصرع سنا کر ان کے چہرے کی خاموشیاں ۔ وہ شہر کو رفتار کی جان دینے اور پھر لے لینے والی سڑکوں پر اپنی رفتار سے گشت اور پھر ان انوکھی اور حیرت زدہ جگہوں کی دریافت کہ جہاں ، رت جگے کے درمیان ، چلتے چلتے ، شہر یک دم ختم ہو جاتا ہے اور محض ہریاول کا ازل حدِ آواز تک نگاہ پاتا ہے ——

اور پھر کبوتر اور ان کے ذریعے ، جب چاہے ، دور سے اپنے شہر کی پاک اور صاف دریافت ۔ یہ تمام وہ عمل ہے کہ جس کی وساطت سے ناصر کاظمی اپنے شہر سے اپنے قدم کا پہلا لمحہ حاصل کرنے کی سعی کرتا تھا ۔

ان ہی دنوں کا ایک قصہ یاد آتا ہے کہ ایک روز ایک سڑک کے کنارے ، ایک درخت تلے ، ہماری ملاقات ہو گئی —— ناصر کی پریشانی کی

کوئی انتہا نہ تھی ––– جب میں نے وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ وہ ایک بین الاقوامی کبوتر کانفرنس منعقد کرنا چاہتا ہے اور ابھی تک یہ طے نہ کر پایا ہے کہ اس کا صدر ژاں پال سارتر کو بنائے یا سیمون دوبووآ کو۔ پتا چلا کہ اور دوستوں کے بعد اب مجھ سے بھی رائے طلب تھی۔ میں نے عرض کیا کہ بھئی میرے نزدیک تو اس عہدے کے واسطے یہ دونوں ناقص ہیں۔ سارتر تو اپنے فلسفے میں انسان تک کو روح کا حامل نہیں گردانتے تو بھلا کبوتر کو کیا درجہ دیں گے۔ رہا دوبووآ کا تو بھائی جس طرح کے کبوتر آپ کے ہیں ان کے واسطے تو یہ خاتون مناسب نہیں۔ کبوتر شاید خود ہی انکار کر دیں۔ پھر مجھ سے پوچھا گیا کہ بھلا آپ کس کو منتخب کریں گے۔ میں نے ایذرا پاؤنڈ کا نام تجویز کیا تھا۔ سنا تھا کہ جب سچ بولنے پر ان کو امریکہ نے پاگل خانے میں قید کیا تو وہاں ان کی کھڑکی میں، ان سے ملنے، چند کبوتر روز آتے تھے۔ سو یہ طے پایا تھا اور ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ صدر سے اوپر ایک سرپرست بھی ہونا چاہیے۔ اس سرپرستی کے واسطے میں نے اپنی جانب سے عمر شیخ مرزا کا نام تجویز کیا تھا –––

عمر شیخ مرزا ظہیرالدین محمد بابر کے والد محترم تھے اور فرغانہ میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر ان کا چھوٹا سا قلعہ تھا۔ ان کو کبوتروں کا بہت شوق تھا اور انھوں نے کبوتروں کے کابک اپنے قلعے کی فصیل پر بنائے ہوئے تھے۔ ایک دن وہ ان سے محو گفتگو تھے کہ زمین میں جنبش ہوئی تھی اور فصیل کا وہ حصہ بمع کابک، کبوتر اور مرزا پہاڑ کے شانے سے پھسل کر ہوا کے سپرد ہوگیا تھا اور بابر ۱۲ برس کی عمر میں فرغانہ کا بادشاہ بنا تھا۔ برسوں بعد بابر نے اس واقع کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ”ایک روز عمر شیخ مرزا اپنے کبوتروں سمیت ہوا کے سپرد ہو کر آسمان پر عقاب بن گئے۔“

یہ بات ناصر کو پسند آئی تھی اور اس نے ہشاش بشاش اپنی راہ لی تھی۔

سو ناصر کی یہ تلاش محض جسمانی سطح کی تلاش نہ تھی بلکہ یہ تلاش سوتے بھی تھی اور سونے سے موقوف ہوتے بھی۔ جسم کی سطح پر بھی تھی اور لہو کے کنارے پر بھی۔ دماغ کے ہر حاضر کھو کھن دانے کا

استعمال اس تلاش میں ہوا تھا اور ، اپنی استطاعت بھر ، بینائی کے ہر ہر موسم اور زمانے کا -

چندوگیہ اوپ نیشاد میں دو طرح کے انسانوں کا بیان آتا ہے - یہ دونوں خواب دیکھتے ہیں -

پہلا اگر اس جہاں میں آپاہج ہوتا ہے تو اپنے خواب میں بھی وہ آپاہج ہی رہتا ہے - وہ اگر یہاں بے لباس ہوتا ہے تو پھر اپنے خواب میں بھی اپنے آپ کو بے لباس ہی دیکھتا ہے ـــ اور جب یہاں ختم ہوتا ہے تو پھر اپنے خواب میں بھی تمام پا جاتا ہے -

دوسرا انسان بھی خواب دیکھتا ہے -

یہ اگر اس جہاں میں آپاہج ہوتا ہے تو پھر اپنے خواب میں تن درست ہو جاتا ہے - اگر اس جہاں میں وہ بے لباس ہوتا ہے تو پھر اپنے خواب میں اپنے کو بالباس دیکھتا ہے - اور جب اس جہاں میں وہ تمام پاتا ہے تو اپنے خواب میں قائم رہتا ہے اور اپنے رب کی جانب قدم بڑھاتا ہے -

مگر یہاں ، اس خوابیدہ راستے کی اکیل میں ، اس کو ایک غیر خلقت پھر آن لیتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ وہ یہاں بھی آپاہج ہو جائے اور اس کا جسم پھر بے لباس ہو کر خاتمہ پائے -

تب یہ انسان بلک بلک کر روتا ہے ـــ

اور کبھی کبھی خدا اس غیر یلغار کو تمام کر کے اس کے خواب کو تکمیل دیتا ہے -

مگر صرف کبھی کبھی -

اپنی زندگی کے آخری کئی برس ناصر محض اپنے خوابوں میں تن درست تھا -

ایک طویل سفر کے بعد جو میں وطن واپس آیا تھا تو اپنے اس دوست کو شدید بیمار پایا تھا - اس نے مجھ سے کہا تھا -

"میں اب تن درست ہو جاؤں گا -" اور تن درست ہو گیا تھا -

پھر اگلے برس جب میں دوبارہ وطن واپس آیا تھا تو اس کو پھر بیمار پایا تھا اور مجھ کو علم ہوا تھا کہ اس جہاں میں وہ اب تن درست نہ ہوگا -

اپنے شہر کی تلاش ناصر کاظمی کی زندگی کا سراغ تھی ۔ سو اس جہان کے آخری ایام میں اس کو اپنے رت جگے ساتھی اکثر یاد آئے تھے ۔ کچھ اس کے پاس تھے اور کچھ کبھی نہ آئے تھے ۔ وہ منتظر رہا تھا کہ وہ تلاش اس کی زندگی کا سراغ تھی —— حتیٰ کہ ایک صبح ، ہمارا یہ دوست ، اپنے رت جگے اپنے ساتھ لے کر ہوا کی سپرد پا گیا تھا ۔ اب تمام دوست آئے تھے اور نہایت اہتمام سے اس سفید مائل لباس کو ، ایک جنگل میں ، شام کی سپرد کرکے ، اپنے اپنے راستے ، بستی کی سمت لوٹ آئے تھے ——

میرا راستہ باغِ جناح کی حدود کو چھوتا ہوا گزرا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ باغِ جناح کی وحشت کو محدود اور پختہ کیا جا چکا ہے اور ایک نئی خلقت نے اس کی نیلی ہریاول والے سکوت تک کو سوقوف کیا ہے ۔

ناصر کاظمی اپنی پسند کے شہر میں اب ایک بار پھر اجنبی ہو چکا تھا ——

تب ہم نے سراغ پرے سے ایک آواز سنی تھی جو کہتی تھی :

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

* * *

چراغوں کا دھواں

منیر احمد شیخ

روایت بن چکی ہے کہ ادیب اور شاعر کے مرنے کے بعد اس کی شخصیت اور فن پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جائے۔ میرا دوست اور شاعر ناصر کاظمی مر گیا مگر نہ تو وہ روایتی قسم کا دوست تھا نہ شاعر۔ اس کا ماتم میں روایتی انداز میں کیوں کر کروں۔ جس دن سے میں نے سنا ہے کہ وہ مر گیا اس دن سے اب تک اس بات کا یقین نہیں آ رہا کہ ناصر جو زندگی سے انتھک پیار کرنے والا، جیتا جاگتا، حسّاس اور زندہ آدمی تھا وہ کیسے مر گیا پھر یہ اگر سچ ہے کہ وہ مر گیا تو کیوں مر گیا؟ اس نے تو جیتے جی کبھی مرنے کی بات نہ کی تھی۔ بلکہ وہ کسی دوست کے مرنے پر اس کی موت کا تذکرہ بھی پسند نہ کرتا تھا۔ جیسے وہ یہ بات سننا ہی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کسی قریبی دوست کو موت بھی آ سکتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ م۔ حسن لطیفی جس شام بڑی بیکسی کی حالت میں ہسپتال میں مر گیا تو ناصر کاظمی نے ٹی ہاؤس میں آن کر بڑی ڈوبی ہوئی آواز میں بس اتنا کہا تھا: "بھئی لطیفی صاحب انتقال کر گئے" اور پھر بڑے اضطراب کے عالم میں سگریٹ پہ سگریٹ سلگانا شروع کر دیا تھا۔ ہم سب لطیفی صاحب کی باتیں کرنے لگے مگر اس شام وہ خاموش رہا جیسے اسے چپ سی لگ گئی ہو۔ ناصر کاظمی دوستوں کی محفل میں ہمیشہ سب سے زیادہ بولا کرتا تھا مگر اس دن وہ چپ رہا۔ اس کا چپ ہو جانا کبھی بھی اچھا شگون نہ ہوتا تھا۔ دوسرے دن پتا چلا کہ وہ بیمار ہو گیا ہے۔ خون کی پیچش لگ گئی ہے۔ پانچ سات روز بعد ملاقات ہوئی تو اس نے بیماری کو چھپا لیا۔ اور م۔ حسن لطیفی کی یوں باتیں کرنے لگا جیسے وہ کسی زندہ شخص کا تذکرہ کر رہا ہو۔ اس نے ایک مرتبہ بھی لطیفی صاحب کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال نہ کیا۔ تو پھر یہ میں کیسے مان لوں کہ

وہ جو کسی دوست کو ماضی کی منوں مٹی میں دفن کرنا گوارا نہ کرتا تھا ، خود ماضی کا حصہ بن گیا ہے ۔ میں تو اُس کے ساتھ ، ایک دو نہیں ، پورے سات برس دن رات اُٹھتا بیٹھتا اور گھومتا رہا ۔ وہ میری ایک جذباتی اور ذہنی ضرورت بن گیا تھا ۔ جس روز اُس سے ملاقات نہیں ہوتی تھی تو یوں لگتا تھا کہ آج سگریٹ نہیں پیا ۔ مگر سگریٹ تو ایک عادت ہے ۔ وہ تو عادت سے زیادہ نفسیاتی ضرورت بن گیا تھا اور اُس کے بغیر سارا دن سنسان اور شام ویران گزرتی تھی ۔ یوں لگتا کہ جیسے آج کا دن زندگی میں سے تفریق ہوگیا ہے ۔ وہ شخص میرے زندہ رہنے کا جواز بن گیا تھا ۔ ایک نشہ تھا جو میں روز کرتا تھا ۔ پھر جب لاہور سے راولپنڈی چلا آیا تو اُس سے ملنا اتفاقی بات ہوگئی ۔ مگر یہ احساس ہی کہ وہ یہیں کہیں پاس ہی ہے ، جب چاہوں گا مل لوں گا ، میرے لیے کافی تھا اور اب جب کہ مجھے اُس کی یاد میں مضمون لکھنے کو کہا جا رہا ہے تو مجھے یہ فرض کرکے چلنا پڑے گا کہ ناصر کاظمی مر چکا ہے ۔ میری حالت تو ابھی اُس شخص کی سی ہے کہ جس کو اُس کی نشہ آوری کی عادت چھڑوانے کے لیے کسی نئے اور تکلیف دہ ڈسپلن کے ماتحت رکھا جاتا ہے ۔ اس عرصے میں اُس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ زندوں میں ہوتا ہے نہ مردوں میں ۔ اُس کے حواس بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہے ہوتے ۔ میرے حواس درست بھی ہوتے تو میں شاید ناصر کاظمی سے پھر بھی انصاف نہ کر سکتا ۔ وہ لوگوں کے لیے صرف شاعر تھا مگر میں نے اُس کی زندگی کے اتنے پہلو اور گوشے دیکھے ہیں کہ اُن کو بیان کرنے لگوں تو دفتر لگ جائیں ۔ مجھے دراصل اُس کی جادوگری نے اپنی طرف کھینچا تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر تھا ہی جادوگر ۔ شاعری ہو یا نثر یا ٹیبل ٹاک وہ رسیاں پھینکتا جاتا اور سانپ نکالتا جاتا ۔ ایک بار جو بھی اُس کے طلسم میں آ گیا پھر وہ باہر نکل نہیں پاتا تھا ۔ گفتگو کرتے کرتے وہ اپنے سامعین کی آنکھوں میں چمک دیکھ کے اور چمکنے لگتا ۔ دوسرے کے آبروؤں کے اشارے بھی دیکھتا جاتا ۔ پھر رات کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے لفظوں کا جادو اور گہرا ہوتا جاتا اور جب آدھی رات ڈھل چکتی تو اُس کی آواز بڑی گمبھیر اور کھرج دار ہو جاتی اور اُس میں ایک تھکا تھکا سا خستہ پن آ جاتا اور یوں لگتا جیسے دور کوئی خوابوں کے دھندلکوں میں

کھڑا بول رہا ہے ۔ لفظ اور فقرے یوں اُس کے لبوں سے اُترتے جیسے وہ خود نہیں بول رہا بلکہ الہام کی حالت میں فقرے خود بخود صبح کی سپیدی میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں ۔ رات کے آخری حصے میں وہ انسان سے ایک ماورائی شکل میں ڈھل جاتا تھا ۔ جیسے روحانی دنیا کی کوئی شے ہو ۔ اُس کا سحر اس لمحے میں ہر شے کو اپنی گرفت میں لے لیتا اور وجود کا سارا بوجھ ختم ہوتا ۔ ہم خوشبوؤں اور پھولوں کی وادی میں اُتر جاتے :

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

جس طرح پتلیوں کا تماشہ صرف رات کے پردے میں ہی ہو سکتا ہے اسی طرح ناصر کاظمی کے لفظوں کے کھلونے شب کی سیاہی میں ہی حرکت میں آتے ۔ وہ کیا کیا جادو جگاتا تھا یہ وہی جانے جس نے اُس کے ساتھ شب خیزی کی ہے ۔ میں اُس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آپ کو بڑا بے بس محسوس کر رہا ہوں ۔ اُس کی ذات کا ست رنگیا کبوتر میرے لفظوں کے جال میں قابو نہیں آ سکتا ۔ اُس کے اتنے رنگ تھے کہ اگر میں کسی ایک رنگ کو بیان کرنے لگوں گا تو پھر میرے لیے ممکن نہ ہوگا کہ میں اس کے باقی رنگ آپ کو دکھا سکوں ۔

میں تو اُسے دیکھ کے جیتا تھا مگر ——

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

میرا اُس سے جذباتی رشتہ اُس کی سحر طرازی کے بعد ہی اُستوار ہوا ۔ مگر پھر اُس کی چاہت آہستہ آہستہ حواس کی تربیت میں بدلتی گئی ۔ اُس کی صحبت میں بیٹھ کر حواس کی واقعی تربیت ہوتی تھی ۔ نظر، آواز، مس، خوشبو، وہ ان سب کا رازداں تھا ۔ میں نے حضرت علی کے خطبے پہلی مرتبہ اُس کی زبان سے سنے ۔ موسیقی اور لفظ کا رشتہ اُس نے کئی محفلوں میں ہم پر وا کیا ۔ وہ اس وجود کی سطح پر نہیں جیتا تھا کہ جس پر ہم سیدھے سادھے دنیا دار جیتے ہیں ۔ اُس نے Fantasies کی ایک وسیع دنیا آباد کر رکھی تھی جس میں وہ ہر وقت رہتا تھا ۔ ہاں ہمیں بھی دوست جان کر رات کی تنہائیوں میں کبھی کبھی ہمارے ہاتھ تھام کے اپنے رنگوں اور خوشبوؤں

کی دنیا کی جھلک دکھا دیتا تھا - یہ اُس کا ہم سب پہ احسان تھا -
کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں اُس کے گھر گیا تو وہ خوشی سے پھول گیا -
کچھ اس طرح کی خاطر تواضح کرنے لگتا کہ مجھے سخت پریشانی ہوتی -
مجھے وہ یہ احساس دلاتا کہ میں نے اُس کے گھر آن کر اس کو کوئی
بہت بڑا مرتبہ دے دیا ہے - میں اُس سے کہتا ، ناصر ، میں تمھارے پاس
چل کے آتا ہوں اپنی ضرورت کے لیے - اسے میری کمزوری سمجھ لو یا
کچھ اور - تم اُلٹے یوں پیش آتے ہوکہ مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے -
میں تو تمھارے پاس پناہ لینے آتا ہوں - گھناؤنی حقیقتوں سے بھاگتا ہوں تو
تمھارے سایے میں مجھے ایک عجب اطمینان حاصل ہوتا ہے - وہ مسکراتا ،
میرے لیے پان بنواتا - پھر اپنے کبوتروں کی کابک کھول کے کبوتروں
کے بے حد خوبصورت جوڑے دکھاتا - اُس کے ہاں طرح طرح کے نسلی کبوتر
تھے - وہ کہتا میری شاعری کبوتروں کے پروں میں سے نکلتی ہے - ذرا
اس نر کو دیکھو - جب یہ طمطراق سے گردن گھماتا ہے تو ساری دنیا
اس کے آگے حقیر ہو جاتی ہے - پھر کبوتروں پہ شاعری شروع ہو جاتی -
ہم روز رات کو ٹی ہاؤس میں ملتے - انتظار حسین ، احمد مشتاق ،
سجاد باقر رضوی اور میں - پھر ایک روز ناصر نے ٹی ہاؤس کی فضا سے
بیزاری کا اعلان کر دیا - یہ بیزاری وقتی قسم کی تھی - ہم ٹی ہاؤس سے
اُٹھ کے لارڈز میں بیٹھنے لگ گئے - یہ یخ بستہ ریستوران تھا - سروس بھی
اچھی تھی اور پھر یہاں اننناس کا رس بھی ملتا تھا - جس کا آرڈر وہ
بڑے شاہانہ طریقے سے دیا کرتا تھا - ہم اس آرڈر پر ایک دوسرے کا منہ
دیکھتے - انتظار حسین کی ہنسی چھوٹ جاتی - سجاد باقر رضوی ، ناصر کاظمی
کی اس ''سنوبری'' پر ، جز بز ہو جاتا اور میں انتظار حسین کی ہنسی میں
اپنی مسکراہٹ شامل کر دیتا - ناصر چڑ جاتا - ''تم سب کمینے ہو -
تمھیں کیا پتا کہ پھل کا رس کیا چیز ہوتا ہے - تم محروم لوگ ہو اور
دنیا کی نعمتوں کے انکاری ہو - نعمتوں کے دروازے تم پر بند ہو چکے ہیں -
تم اپنی مسکراہٹوں میں جو ظاہر کر رہے ہو وہ احساسِ محرومی ہے -'' وہ
بولتا جاتا اور ہماری ہنسی ہمارے اختیار سے باہر ہوتی جاتی - واقعہ یہ ہے کہ
وہ فرسٹ کلاس ریستورانوں اور فرسٹ کلاس کھانوں کا ہی نہیں بلکہ دنیا کی
ہر چیز اور ہر کام میں صرف فرسٹ کلاس ہی کا قائل تھا - سفر وہ ہوائی جہاز

میں کرنا پسند کرتا اور ہوائی سفر کے بعد کئی کئی دن اس سفر کے تذکرے شاعرانہ تعلی کے ساتھ کرتا - ہوائی جہاز کے کیپٹن کو پرواز کے دوران پتا چلتا کہ ناصر کاظمی بھی مسافروں میں بیٹھا ہوا ہے تو وہ کنٹرول چھوڑ کر اُس کی سیٹ کے پاس آن کر اُسے سلام کرتا - تقریباً ہر کیپٹن نے ''برگِ نے'' پڑھی ہوتی اور وہ ناصر کی صحبت کا لطف اُٹھانے کے لیے اُسے پائیلٹ کی کیبن میں لے جاتا - ریل گاڑی میں ایئر کنڈیشنڈ کا ڈبہ اُس کی بڑی کمزوری تھی - بس کے سفر سے اُسے سخت نفرت تھی - ایک مرتبہ ایک بھری بھرائی اومنی بس میں سے اُترا تو اُترتے ہی غصے میں بس کو گالیاں دینی شروع کر دیں - پوچھا کہ کیا ہوا ہے - کہنے لگا اسی لیے تو بس میں بیٹھتا نہیں کہ پتلون کی کریز ختم ہو جاتی ہے - اور دیر تک دوستوں کو کوستا رہا کہ کسی کے پاس کار نہیں کم از کم چلنا پھرنا تو ٹھکانے سے ہو - فلم وہ بالکل نہیں دیکھتا تھا - البتہ جب اُس کی جیب میں اتنے پیسے ہوتے کہ وہ پورا باکس ریزرو کروا سکتا تو اپنی بیوی بچوں کو سنیما لے جاتا - ہر بار گرمیوں میں وہ بیوی بچوں سمیت پہاڑ پر جانے کا لمبا چوڑا پروگرام بناتا اور جب کوئی فرسٹ کلاس قسم کا انتظام ہو جاتا تو پھر روانہ ہوتا - اپنی کتاب کی اشاعت کے معاملے میں بھی وہ کسی فرسٹ کلاس پبلشر کی تلاش میں رہتا - ایک دفعہ میں نے تنگ آ کر کہا کہ ناصر کاظمی اب تمھارا دوسرا مجموعہ چھپ جانا چاہیے - کہنے لگا '' تمھیں پتا ہے کہ کتاب کے لیے پبلشر ڈھونڈھنا کیا ہوتا ہے - یہ بیٹی کے لیے بَر ڈھونڈھنا ہے - جس بیٹی کو اتنے برسوں میں نے پیار ، محبت اور خونِ جگر دے دے کے پالا ہو اُسے کیا کسی ایسے شخص کے حوالے کر دوں جو اُس کی قدر و قیمت ہی نہ پہچان سکے ؟ نہیں چھپتی تو نہ چھپے - مجھے کوئی جلدی نہیں ہے -''

ریستوران میں جب کبھی کھانے کا وقت ہو جاتا تو پھر وہ بیرے سے کھانے کی فہرست مانگتا - اُس کے آرڈر میں ہمیشہ قیمتی ڈشز ہوتیں - یہ سب کچھ وہ اس اہتمام سے کرتا جیسے یہ کوئی تقریب کا موقعہ ہو - انبالے سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اُس نے جو فاقے اور محرومیاں برسوں دیکھی تھیں ، یہ طرزِ عمل اُن کا ردِ عمل تھا - وہ ہمارے معیار کے لحاظ سے ایک غریب آدمی تھا مگر اُس کا مزاج شاہانہ تھا - اور اُس نے جیتے جی کبھی اس مکروہ حقیقت کو تسلیم کر کے دیا ہی نہیں کہ وہ

دنیوی نعمتوں سے محروم ہے لٰہذا اُسے اُسی حالت پر قناعت کرنی چاہیے جو ہمارے معاشرے میں فن کار کا مقدر بن چکی ہے - اُسے تھرڈ کلاس معاشرے میں تھرڈ کلاس سیٹ پر بیٹھنا کبھی گوارا نہ تھا - چنانچہ یہی ہوتا تھا کہ اُس نے اپنی مالی بے بضاعتی کے باوصف اپنے ارد گرد ایسا ماحول بنا لیا تھا کہ فرسٹ کلاس چیزیں اور نعمتیں اُسے میسر ہوتی تھیں - مگر کہیں اس سے یہ نہ خیال کیجیے گا کہ یہ سب خواہشیں اُس کی زندگی کا کوئی مقصد بن گئی تھیں - برخلاف اس کے بات یہ تھی کہ وہ ایک شاعر تھا اور ایک اچھا شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنی قیمت بھی لگاتا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ بھی اُس کے مقام ، مرتبے اور حیثیت کو پہچانیں - وہ اگر معاشرے کو اپنا خون دے کر خوب سے خوب تر بناتا ہے اور اس کی نوک پلک درست کرتا ہے ، دلوں کے دکھوں کو سمجھتا ہے اور ان دکھوں کا مداوا بھی کرتا ہے تو پھر معاشرے کو اُس کے سامنے جھکنا چاہیے - اگر جھکتا نہیں تو کم از کم اُسے اُس کی خدمت بجا لانا چاہیے - یہ معاشرے کا کوئی احسان نہیں ، اُس کا فرض ہے - وہ کہتا کہ زندگی کو رونق اور جلا میرے وجود سے ملتی ہے :

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے

ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق
شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے

اُسے اپنا تخت بہت پیارا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ حاکمانِ وقت اُس کی چوکھٹ پر آن کے اُسے سلام کریں اور اُس کے قدموں میں بیٹھیں - اور جب اس خواہش کے برعکس اُسے دکھائی یہ دیتا تھا کہ اس معاشرے میں قدر و منزلت شاعر اور ادیب کی نہیں بلکہ سی - ایس - پی ، پولیس آفیسر یا تحصیل دار کی ہے تو اس کا مسئلہ یہ بن جاتا کہ اصل چیز معاشرے میں قوت حاصل کرنا ہے اور یہ قوت حاصل ہو تو باقی سب چیزیں آسان ہو جاتی ہیں - بہت سے سی - ایس - پی آفیسر اُس کے مداح اور عقیدت مند

تھے اور وہ اُن کی غیر حاضری میں جب بھی اُن میں سے کسی کا ذکر کرتا تو ہمیشہ یہ کہتا کہ فلاں تو میرا پتر ہے - میرا نام اُس کے آگے لینا - کام کرنا تو ایک طرف رہا تمھارا غلام ہو جائے گا - اپنے ٹی ہاوس کے ساتھیوں میں جب کوئی ادیب ، شاعر اور دانش ور کسی اچھی سی سرکاری نوکری کو حاصل کر لیتا تو اُس کے سبھی ساتھی ماتم کرتے سوائے ناصر کاظمی کے - ناصر کاظمی ایسے دوستوں سے لڑتا جو یہ کہتے کہ بس اس شخص نے تو مصالحت کر لی ہے اور اب Settle ہوگیا ہے - ادب کی خدمت اُسے عزیز ہوتی تو وہ یہ سودا کبھی نہ کرتا - ناصر کہتا کہ آپ سب اُلو کے پٹھے ہیں - آپ چاہتے ہیں کہ وہ اس ٹی ہاؤس میں ساری عمر بیٹھا شاعری کرتا رہتا - بیکار بیٹھا بیٹھا مریض بن جاتا ، ناکارہ ہو جاتا ، اپاہج ہو جاتا - پھر لوگ اُس پر رحم اور ترس کھاتے —— تو آپ خوش تھے - ادب ودب جائے بھاڑ میں - بھائی صاحب پہلی چیز زندگی میں صحت ، قوت اور انسانیت ہے - آپ کے ہاں کھانے کو کچھ نہیں ، آپ معاشرے کو درست کیسے کریں گے -

اختر محمود ، غالب احمد ، مظفر علی سید اور نور عالم جب سرکاری ملازمتوں پر چلے گئے تو وہ واحد شخص تھا جو سب سے لڑتا اور کہتا کہ انھوں نے ٹھیک ہی کیا ہے - خدا کا شکر ہے کہ یہ یہاں سے نکلے ہیں - میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتا تھا - پھر جب وہاں سے وزارتِ اطلاعات کے لیے منتخب ہوا تو میں نے دوستوں سے مشورہ کیا - انتظار حسین ، سجاد باقر رضوی ، شہرت بخاری سب نے کہا چھوڑو ، اس کام میں کیا رکھا ہے - پھر لاہور شہر چھوڑ کے تم مفصلات میں جا بیٹھو گے - ناصر کاظمی نے کہا کہ ان میں سے کسی حرام زادے کی بات نہ سنو - مفصلات میں رہنے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اپنی تنہائی کے زہر کو تخلیقی قوت بنا کے جی سکتا ہے - تم ضرور جاؤ - شاعری اور ادب کا کسی جگہ سے تعلق نہیں ہوتا - یہ تو من کی جوت ہے - آدمی کے اندر کچھ ہو تو وہ کبھی تنہا نہیں ہو سکتا -

یہ کہ وہ کس قدر اہم اور طاقت ور ہے - اس کا اظہار وہ کئی طرح سے کرتا -

"جب میں مشاعرہ پڑھنے کے لیے ملتان گیا اور ریلوے اسٹیشن پر اُترا تو کمیٹی والوں نے پورے رستے میں چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔"

"یہ دو کبوتر ملتان کے انسپکٹر جنرل پولیس نے جیپ پر لاہور بھیجے ہیں ---" انتظار نے میری طرف دیکھا اور ہم سازشیوں کے انداز میں مسکرا دیے۔

جب ایوب خانی مارشل لاء لگا تو ایک دفعہ یوں ہوا کہ صدر ایوب چل کر اُس کے گھر آئے۔ پھر ناصر کاظمی نے جنرل ایوب کو کچھ مشورے دے اور اگلے دن اُس نے تین جرنیل نوکری سے برخاست کر دیے --- ! یہ لمبی داستانیں ہیں مگر میں آپ کو صرف اطلاعاً بتلا رہا ہوں۔ ایوب خانی مارشل لاء کے آغاز میں سرکاری ملازمین کو دفتر میں وقت پر آنے کی خاص تاکید کی گئی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس پابندی پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے فوجی حکام بعض دفاتر میں چیکنگ کے لیے آ جاتے۔ ناصر کاظمی اُن دنوں ولیج ایڈ کے دفتر میں ایک سرکاری پرچے کا ایڈیٹر تھا۔ مارشل لاء سے اگلے دن یہ حسبِ معمول گیارہ بجے جب دفتر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک میجر صاحب اُس کی کرسی پر براجمان ہیں۔ ناصر کاظمی کمرے میں داخل ہوتا ہے:

ناصر کاظمی (میجر سے) : السلام علیکم۔

میجر : و علیکم السلام۔ آپ کون ہیں ؟

ناصر : میں یہاں اس دفتر میں پرچے کا ایڈیٹر ہوں۔

میجر : آپ اس وقت دفتر آتے ہیں ؟

ناصر : جی ہاں ! نو بجے میری آنکھ کھلتی ہے۔ دس بجے تک مجھے کوئی چیز صاف سے دکھائی نہیں دیتی۔ سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آتا ہے۔ اسی عالم میں ناشتہ کرتا ہوں۔ گیارہ بجے چیزیں ذرا واضح ہونے لگتی ہیں تو میں دفتر کو چل پڑتا ہوں۔

میجر : اچھا تو گیارہ بجے تک آپ خواب کے عالم میں ہوتے ہیں ؟

ناصر : گیارہ بجے تو آپ کے پوچھنے پر بتلا دیا ویسے میں دن کو

سویا رہتا ہوں اور رات جوں جوں ڈھلتی جاتی ہے میری آنکھ کھلتی جاتی ہے -

میجر : تمھیں پتا ہے کہ میں کون ہوں ؟

ناصر : یہ تو مجھے پتا نہیں آپ کون ہیں ، البتہ آپ ناصر کاظمی سے بات کر رہے ہیں -

میجر : آپ ناظر کاظمی ہیں .... ؟

ناصر : ہاں ، میں ہی ناصر کاظمی ہوں -

میجر : مجھے معاف کر دیجیے گا - مجھ سے گستاخی ہو گئی - مجھے کیا پتا تھا کہ میں ناصر کاظمی سے بات کر رہا ہوں (سلوٹ مارتا ہے اور کرسی کھینچ کر ناصر کاظمی کو پیش کرتا ہے) -

ناصر کاظمی : شکریہ - تشریف رکھیے -

میجر : آپ کی "برگِ نے" تو میری بک شلف کی زینت ہے -

ناصر کاظمی : یہ تو کافی نہیں - میرا کوئی شعر آپ کو یاد ہے ؟

میجر : جی ہاں - کیوں نہیں -

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اُس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

ناصر کاظمی : (مسکرا دیتا ہے) یہ شعر تو ہر ایک کو یاد ہے (پھر اُس کا کندھا تھپکتے ہوئے) مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی - آج سے آپ میرے بیٹے ہیں - فوج اور سول سروس میں میرے اور بھی بہت سے بیٹے آپ کو ملیں گے -

فوجی افسر اور سی - ایس - پی کو نیچے لگا کر اُسے بڑی فتح مندی کا احساس ہوا کرتا تھا - ایک دفعہ میں نے اُس کے رویے پر سخت تنقید کی اور کہا کہ سی - ایس - پی سے ملنا جلنا تمھارے مرتبے سے بہت نیچے کی بات ہے - تم اس طرح اپنے آپ کو سستا کر دو گے - اُس نے بڑے پیار سے مجھے سمجھایا کہ سی - ایس - پی کوئی توپ چیز نہیں اور مجھے ان سے

لینا بھی کیا ہوتا ہے - زمین میں نے الاٹ نہیں کروائی ، کارخانہ مجھے نہیں چاہیے ، ملازمت کی تمنا میں نے نہیں کی - یہ طبقہ عوام اور دانش وروں سے اتنا دور ہو گیا ہے کہ یہ ہمارے Idiom تک نہیں سمجھتا - میں ان کے پاس بیٹھا ہوں تو انھیں ادب و شاعری کی زبان سے روشناس کرواتا ہوں - یہ تنہا لوگ ہیں - اپنے اپنے خول میں بند - میں انھیں ان کے خول سے نکال کے باہر کھلی ہوا میں لاتا ہوں تاکہ انھیں اپنے علاوہ کوئی اور بھی نظر آئے - یہ عوام کی بہت بڑی خدمت ہے جو میں ادا کر رہا ہوں - تم دیکھتے نہیں کہ میری تلاش میں وہ مجھے ڈھونڈھ کے ملتے ہیں - نہایت فرمانبرداری سے سامنے بیٹھتے ہیں - خدمت بجا لاتے ہیں - پہچاننا شروع کر دیتے ہیں - میں ڈانٹ بھی دیتا ہوں تو آگے سے نہیں بولتے - ان سب باتوں کو چھوڑو - اس طبقے کے پاس طاقت ہے - یہ اس طاقت کا غلط استعمال کرتے رہتے ہیں - میں ان کے دلوں کو موم کرتا ہوں - تاکہ کل کلاں کو جب موقع آئے تو یہ ادیب کی اہمیت کا احساس کریں اور اپنی قوت کو اُس کی قوت کے آگے زیر کر دیں -

مجھے کوئی ایسا موقع یاد نہیں جب میری اور اُس کی صحبت میں اُس نے اس بات پر تأسف نہ کیا ہو کہ وہ فوج میں سپاہی کیوں نہ بن سکا - سپاہی کی زندگی پر وہ مرتا تھا - ایک دفعہ اُس نے بتلایا کہ اُس کی مدتوں یہ خواہش رہی کہ وہ ہوائی فوج میں ہوتا اور ہوائی جہاز اُڑاتا - ہوائی فوج کے جہازوں کی پرواز کو وہ اپنے الہامی لمحوں میں کچھ اس طرح بیان کرتا کہ اُس سے اندازہ ہوتا کہ یہ شخص ہمیشہ ہواؤں میں اُڑنے والا تھا مگر زمین نے اُس کے پاؤں باندھ کے اُس پہ بہت بڑا ظلم کیا ہے - وہ کہتا ہوائی جہاز اُڑانا میکانکی فعل نہیں - یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ یہ ساز بجانے کے مترادف ہے - میں جب کسی ہوا باز کو اُلٹے سیدھے ہواؤں کو کاٹتا دیکھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ ایک موسیقار وائلن بجا رہا ہے - یوں بھی جب وہ احمد مشتاق ، انتظار حسین یا سجاد باقر رضوی سے کبھی ناراض ہو جاتا تو غصے کے عالم میں فوجی کمانڈروں کی طرح اُنھیں ڈانٹتا - احمد مشتاق اُس کے لیے اکثر اوقات لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بن جاتا اور ناصر اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے اپنے لہجے میں ایسا دبدبہ پیدا کر لیتا جو صرف ایگزیکٹو اتھارٹی کے پاس ہی ہوتا ہے - دوستوں سے کئی مرتبہ

لڑائیاں بھی ہوتی تھیں ۔ مگر میں نے دیکھا کہ ناصر کاظمی غصے میں سب کچھ کہہ دیتا تھا مگر کبھی بھی ذاتی حملہ نہیں کرتا تھا ۔ اس معاملے میں اُس کی وضع داری اور شرافت کی میں قسم کھاتا ہوں مگر اُس کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کے باوجود وضع داری کا یہ انداز ہم نے اُس سے نہ سیکھا ۔ وہ زبان و بیاں کی حرمت کے علاوہ خاندانی شرافت اور نجابت کا بڑی شدت سے قائل تھا ۔ سفلے اور ہلکے آدمی اُس کے حلقے میں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتے تھے ۔ ناصر کاظمی کے بارے میں مَیں جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ محبت کا پاس رکھنے والے اور وفا کرنے والے اس دنیا سے اُٹھتے جا رہے ہیں ۔ اُسی نے کہا تھا :

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے

مگر ناصر کا ہمیں چھوڑ جانا تو کچھ اس سے بھی زیادہ ہے :

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسے اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

کبھی کبھی وہ اپنے شعر کہنے کے پورے عمل کو فوجی اصطلاحوں میں پیش کرتا ۔ اکثر کہا کرتا کہ میں تو لفظوں کا سپاہی ہوں ۔ وہ میری شاعری میں جب پریڈ کرتے ہوئے آتے ہیں تو میرے احکام کے پوری طرح تابع ہوتے ہیں ۔ لفظ کی کیا شان ہے ؟ اُس کا موقع محل کیا ہے ؟ اُس کی آواز کیا ہے ؟ اُس کا مرتبہ کیا ہے ؟ اُس کی ذات ، حیثیت ، تاثیر اور ردِ عمل کیا ہے ۔ اس پہ وہ بڑا بڑا فلسفہ سامنے لاتا ۔ اُس کی گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ وہ لفظوں کو بڑی ذہانت اور چابک دستی سے استعمال کرتا ہے ۔ اُن کی نشست و برخاست کا پورا خیال رکھتا تھا ۔ کسی کی ٹانگ کھینچنی مقصود ہوتی تو کبھی سیدھا سپاٹ فقرہ نہ بولتا ۔ "تو" اور "بھی" کے استعمال سے اُس نے ایسا ایسا فقرہ ایجاد کیا کہ بے ساختہ داد دینا پڑتی تھی ۔ لفظ "تو" اور "بھی" کے استعمال سے اُس نے بڑے بڑے لوگوں سے شرارتیں کیں ۔ کسی بور قسم کے شاعر سے اُس کی نظم یا غزل سننا لازم ہو جاتی تو ایسے شخص سے کبھی یہ نہ کہتا کہ شعر سنائیے ۔ ہمیشہ کہتا کہ جی ہاں تو آپ کا "کلام" ہم بھی سنیں ۔ اگر کوئی

انجانا شخص اُس سے فرمائش کر دیتا کہ اپنا کلام سنائیے تو وہ ہمیشہ ٹوک دیتا کہ کلام ولام تو میرے پاس نہیں ہے۔

ناصر کاظمی کی شاعری میں اُس کا عہد سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ ہجرت سے لے کر سیاسی تموج تک ہر سانحے اور واقعے کی لہریں اُس کی شاعری میں موجود ہیں۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ ملک میں بڑے بڑے سیاسی واقعات اور تبدیلیاں رونما ہوئیں مگر ناصر کاظمی نے سیاست کو کبھی موضوعِ گفتگو نہ بنایا۔ ٹی ہاؤس کی میز پر سیاسی بحثوں میں بڑی گرما گرمی ہو جاتی۔ جبڑے پھیل جاتے اور مزاج برہم ہو جاتے مگر ایک مرتبہ ایسا نہیں ہوا کہ ناصر کاظمی نے سیاست پر بات کرنی پسند کی ہو۔ سیاسی گفتگو کے معاملے میں اُس کا رویہ بالعموم حقارت کا تھا۔ وہ ایسی باتوں کو خاطر میں نہ لاتا اور اُن پر بحث کرنا اپنی شانِ شایاں نہ سمجھتا تھا۔ یہ کام اُس نے احمد مشتاق کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ اُسے کبھی ''پولیٹکل تھنکر'' کہتا اور کبھی ''مڈل ایسٹ ایکسپرٹ'' اور ہمیشہ اس بات پر اُس کا مذاق اڑاتا۔ وہ سیاسی گفتگو کو تضیعِ اوقات کے برابر سمجھتا تھا مگر پھر چپکے سے کسی شام ایسی غزل کہہ کے لے آتا تھا کہ سیاسی صورتِ حال اُس کے شعروں میں سانس لے رہی ہوتی:

روئے ہم موسمِ بہار کے بعد
اب کے پت جھڑ میں کتنے پھول کھلے

کپڑے بدل کر بال بنا کر کہاں چلے ہو کس کے لیے
رات بہت کالی ہے ناصر گھر میں رہو تو بہتر ہے

انصاف کا دن قریب تر ہے
پھر داد طلب ہے بے گناہی

آئینِ جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

اُنھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر
خار و خس کی طرح بہائے گئے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ
سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فن کار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ

غرض سینکڑوں اشعار اس مضمون کے ہیں۔ کن کن کا ذکر کیا جائے۔ سیاسی حالات کا مطالعہ وہ باطن کی آنکھ سے چپکے چپکے کرتا رہتا اور ان حالات سے پیدا ہونے والی فضا کا تاثر اپنے اشعار میں سموتا کہ اُس کے اظہار کا میدان بھی یہی تھا۔ اُس کی گفتگو کا محور روزنامے، ہفت روزے اور روزانہ کے واقعات نہ ہوتے تھے۔ اُس نے کافی ہاؤس میں بیٹھنا بھی اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ یہاں صحافی اور سیاست دان وقتی سیاست کی ہنگامہ پرور بحثوں میں ایک دوسرے کے گلے آنے لگ گئے تھے۔ آج کسی کو گالیاں ملی ہیں تو کل سرِعام قمیص پھاڑ کے ننگے جسم نکال دیا گیا ہے۔ یہ فضا ناصر کاظمی کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ تھی۔ سیاسی مباحث سے اُسے انھیں وجوہات کی بنا پر نفرت ہو گئی تھی۔ وہ کبھی کبھی اس سارے ہجوم میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتا۔ یہ سب لوگ اُس

کے لیے بے معنی ہوگئے تھے ۔ نہ یہ اُس کی زبان سمجھتے تھے ، نہ وہ ان کے ہنگاموں کو سمجھتا تھا ۔ چنانچہ اُس نے درختوں سے دوستی کر لی تھی ۔ چڑیوں کو اپنا ہم راز بنا لیا تھا ۔ کبوتروں کی صحبت اختیار کر لی تھی ۔ چڑیاں اُسے صبح کو جگاتی تھیں ۔ اپنے گھونسلوں سے اُتر کر اُس کے سرہانے آن بیٹھتی تھیں ۔ وہ کہتا "جو یہ کہتی ہیں میں وہ سنتا ہوں اور خدا کی قسم اگر تم بھی وہ سن لو جو یہ کہتی ہیں تو تم بستی چھوڑ جاؤ ! یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ ان سے صبح دم ہم کلام ہوتا ہوں اور پھر جیے جاتا ہوں ۔"

جب مال روڈ کو چوڑا کرنے کے لیے کارپوریشن نے سایہ دار درخت کاٹ کے ، سڑک کے ایک طرف پھینک دیے تو اُس شام اس نے مجلسِ عزاء برپا کر دی ۔ درختوں کے لاشوں کو دیکھ کر وہ کئی دن تک روتا رہا جیسے اُس کا کوئی اپنا قتل ہوگیا ہو ۔ ایک دفعہ وہ پھر تنہا ہوگیا اور پھر اُس نے ان درختوں کا بے حد خوب صورت مرثیہ لکھا ۔ مرنے سے پہلے اُس نے ایک انٹرویو میں جو آخری پیغام دیا وہ یہ تھا کہ "میں تو بستر سے اُٹھ کر شہر نہیں جا سکتا ۔ آپ شہر کے درختوں اور چڑیوں کو میرا سلام کہہ دیں ۔" یہ اُس کا آخری سلام تھا اپنے دوستوں اور ہم عصر ساتھیوں کے نام ۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب تلک اس شہر کے درخت سرسبز ہیں اور چڑیاں چہچہاتی رہیں گی ناصر زندہ رہے گا ۔

ناصر کاظمی کی گفتگو ادب اور فنونِ لطیفہ پر ہی ہوتی اور قدرت نے اُس کو ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ وہ لفظوں اور فقروں کی قوس و قزح بناتا تھا اور اُس کے پاس بیٹھنے والے اس قوس و قزاح کے رنگوں میں کچھ اس طرح کھو جاتے کہ بس یہی جی چاہتا کہ کبھی صبح نہ ہو اور یہ شخص بولتا چلا جائے ۔ شاعری کے بیان میں وہ بڑے بڑے باریک نکتے نکالتا ۔ میر و غالب کا بیان ہو یا نئی نسل کے شعراء ظفر اقبال اور احمد مشتاق کی کسی نئی غزل کا تذکرہ ، وہ ایک ایک شعر کی بناوٹ ، اُس کے لہجے اور اُس کے خیال پر ایسے ایسے زاویوں سے روشنی ڈالتا کہ اُس سے شعر کا لطف دوگنا ہو جاتا ۔ اُس کا اوڑھنا بچھونا ہی شعر تھا اور وہ تصور کی دنیا میں اتنا اونچا اُڑتا رہتا کہ جب زندگی کی گھناؤنی حقیقتیں ملازمت کے بندھنوں کی شکل میں سامنے آتیں تو وہ دنیا داری کی تمام روایتوں کو

پسِ پشت ڈال کر بھاگ جاتا ۔ ایک مدت تک وہ مفرور رہا ۔ ایک مرتبہ تحصیل داری میں اُس کا نام آ گیا ۔ ایک دن نوکری پہ گیا ۔ دوسرے روز بغیر کسی استعفیٰ کے مفرور ہوگیا ۔ پاکستان بننے کے ساتھ وہ کئی برس بے روزگار رہا ۔ اُس کے دوستوں اور خیر خواہوں نے کئی مرتبہ مختلف قسم کی نوکریوں کے بندوبست کیے مگر اُس معاملے میں وہ ہر ایک کو غچہ دے جاتا اور سب سے بڑھ کر اپنی بیوی اور بچوں کو بھی ۔ اُس کے کئی دوست اُس سے ناراض بھی ہو گئے مگر وہ اپنے آپ کو کسی میکانکی نظام کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھا ۔ پابندی کے خلاف اُس کی بغاوت کا علم اُس کے قریبی اور دور کے سبھی جاننے والوں کو تھا ۔ چنانچہ جب اُس نے ایک دن اعلان کیا کہ وہ شادی کروا رہا ہے تو کسی کو یقین نہ آیا ۔ حفیظ ہوشیار پوری نے شادی کی تاریخ نکالی : **پابند ناصر کاظمی ۔**

بے روزگاری کے اس زمانے میں ناصر کاظمی کی بیوی نے جس ایثار ، حوصلے ، استقامت اور وفا کا ثبوت دیا وہ اس دنیا میں شاید دو چار شوہروں کو ہی نصیب ہوگا ۔ ناصر کاظمی بیوی کے معاملے میں بہت خوش نصیب تھا اور اگر میں یہ کہوں کہ آوارگی اور شاعری کی فرصت جو اس دنیا میں ناصر کاظمی کو ملی وہ اسی شریکِ حیات کے دم سے تھی کہ جو اُن دنوں چولھے پر ہنڈیا میں خالی پانی رکھ کے رشتہ داروں کو یہ تاثر دیتی تھی کہ اُس کے گھر میں بھی آگ جاتی ہے اور کھانا بھی پکتا ہے ۔ مگر ناصر کاظمی بے حس آدمی نہیں تھا ۔ اُسے سب کچھ دکھائی دیتا تھا مگر وہ طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھا ۔ اُوپر سے ستم ظریفی یہ ہوگئی تھی کہ بیگم ناصر کاظمی کو یہ پتا چل گیا تھا کہ یہ شخص محض اُس کا شوہر ہی نہیں ، ایک عمدہ شاعر بھی ہے ۔ دنیا نہ جانے کیا کیا کہتی رہی مگر ناصر کی بیوی ایک مرتبہ بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی ۔ بلکہ ہر ممکن یہ کوشش کی کہ ناصر کو غمِ روزگار کی ہوا تک نہ لگے ۔ جوانی ہی میں اُس کے سیاہ بالوں میں سفیدی کی جھلک آنے لگی تھی ۔ مگر اُس کے دل میں ناصر کاظمی کی فنّی معراج کے ساتھ ساتھ رعنائیاں آ رہی تھیں اور اُس نے ناصر کو گھر میں ایسا ماحول عطا کر دیا تھا کہ اُسے فکرِ شعر کے علاوہ زمانے کی اور کوئی فکر نہ رہے ۔ پھر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی نے محسوس کیا کہ اُسے کچھ نہ کچھ کر ہی لینا چاہیے ۔

پہلے ترقیٔ دیہات میں کچھ دیر کام کیا ، پھر سوشل ویلفیئر کے محکمے میں جاتا رہا ۔ اُن دنوں اُس نے ہاتھ میں چمڑے کا ایک پورٹ فولیو بھی پکڑنا شروع کر دیا ۔ اُسے کسی نے کھول کر دیکھا نہیں تھا مگر سب دوست حیران ہوا کرتے کہ آخر اس میں وہ کیا بند کرتا ہے ۔ ناصر کاظمی کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان کی ''سوشل پرابلمز'' پر مقالا لکھ رہا ہے ۔ مگر ایک شام جب ٹی ہاؤس کے سامنے ایک نل کے پاس کھڑا منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا اور اُس کا چمڑے کا بیگ اُس کے دائیں بازو سے لٹکا ہوا تھا تو احمد مشتاق نے ٹی ہاؤس کے شیشے میں سے لوگوں کو یہ منظر دکھاتے ہوئے شور مچا دیا : ”وہ دیکھو وہ دیکھو ! ناصر کاظمی بیگ میں پانی بھر رہا ہے ۔“ اس کے بعد ناصر کاظمی نے وہ بیگ کبھی نہ اُٹھایا ۔

آخر میں اُس نے ریڈیو کی باقاعدہ نوکری کر لی اور وہیں پچھلے کئی برس سے وہ کام کر رہا تھا ۔ ریڈیو میں اُس نے ''سفینۂ غزل'' جیسے عمدہ اور اعلیٰ سکرپٹ لکھے اور خود اپنی خوب صورت گھری آواز میں انھیں براڈکاسٹ بھی کیا ۔ ان پروگراموں کو سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ ناصر اتنا سنجیدہ اور باقاعدہ بھی ہو سکتا ہے جتنا کہ وہ ان پروگراموں کی پیش کش میں نظر آتا تھا ۔ میرا خیال ہے کہ ریڈیو کی تاریخ میں اردو غزل اور اردو شاعری کے اساتذہ پر اتنے خوب صورت پروگرام شاید ہی ہوئے ہوں ۔ ہم سب اُس کے باقاعدہ کام پر جانے سے خوش تھے اور اگر کوئی ناخوش تھا تو وہ ناصر کاظمی ۔ ریڈیو میں سٹاف آرٹسٹ کا جو مقام اور حیثیت ہے اُس سے اُسے سخت کوفت ہوتی تھی اور وہ ہر وقت کڑھتا رہتا ۔ اندر ہی اندر گھلتا رہتا ۔ ریڈیو کی ملازمت کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ چائے خانوں میں جانا بھی بہت کم کر دیا ۔ مہینوں اُس کی شکل نظر نہ آتی ۔ دفتر کے بعد گھر ہی میں پڑا رہتا ۔ شام کے بعد وہیں شہر کے کبوتر باز آ جاتے اور یہی اُس کے آخری دنوں میں اُس کے سب سے زیادہ قریب تھے ۔ دوستوں سے پتا چلا کہ اُس سے اُس کے مکان پر ہی ملاقات ہو جاتی ہے ۔ وہ خود اب نہیں نکلتا ۔ میرا دل اُس کی زندگی کی اس تبدیلی پہ ہی ڈر گیا تھا ۔ وہ دوستوں کی صحبت کا ایسا رسیا تھا کہ جب کبھی رات کو ہم سے کوئی اُٹھنے کی تیاری کرتا تو وہ اُسے ذاتی بے عزتی سمجھتا ۔ اُس نے گوشہ نشینی کیوں اختیار کر لی ؟ وہ تو لوگوں کو اُن کی تنہائیوں

سے باہر نکال کے آباد کیا کرتا تھا اور روشنی دکھاتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو بند کمرے کی تاریکی میں مقید کیسے کر لیا؟ منیر نیازی کہتا ہے کہ اُس کی موت سے قربت اُسی روز سے شروع ہو گئی تھی جس دن سے وہ ریڈیو میں چلا گیا تھا۔ وہ اس سسٹم میں زندہ رہ ہی نہیں سکتا تھا جس میں وہ جکڑا گیا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ یہ درست ہے کہ ریڈیو کی نوکری سے اُس نے مصالحت کر لی تھی مگر اب وہ خوش نہیں رہتا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ جان سکا کہ وہ کون سا روگ لیے پھرتا ہے۔ دوسروں کی حالت کا نقشہ تو وہ بڑی انوکھی اور خوب صورت تصویروں میں دکھانے کا بادشاہ تھا مگر اُس کا اپنا نقشہ کیا صورت اختیار کر رہا ہے یہ اُس کے روز کے ملنے والوں کو بھی معلوم نہ ہو سکا۔

ناصر کاظمی لفظی تصویروں سے بڑی سے بڑی بات ایک آدھ جملے میں کہہ جاتا تھا۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری کے سلسلے میں ایک دن بحث ہو رہی تھی ناصر نے اختتامیہ جملہ کہا:

"جوش صاحب ہاتھی پہ بیٹھ کے شکار کرنے نکلتے ہیں مگر مار کے چڑیا لاتے ہیں۔"

انتظار حسین کو ایک دفعہ کراچی میں منتقل ہونے کا سودا سمایا۔ ناصر نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آ جائے مگر وہ مصر رہا۔ تنگ آ کر ناصر نے انتظار کو خبردار کیا۔ "جاؤ۔ چلے جاؤ۔ مگر یاد رکھنا کہ کراچی والے تمہارا وہی حال کریں گے جو میں نے گھر میں بیوی کا کر دیا ہے۔" انتظار حسین ڈر گیا۔

مگر میں تو بات اُس کے روگ کی کر رہا تھا۔ کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ناصر کاظمی کے ذکر میں اُس کی باتیں روئی کے گالوں کی طرح سامنے اُڑ رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسے چھوڑوں، کسے پکڑوں۔ میں اُسے چھو ہی نہیں سکتا۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی اس مجبوری کا احساس گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ناصر کاظمی جس کو میں نے دیکھا اور سنا ہے، وہ یہ تو نہیں تھا۔ آج اپنی بے بضاعتی کے ساتھ ساتھ اس مجبوری پہ غصہ بھی آ رہا ہے کہ لفظ بہرحال لفظ ہے۔ یہ جتنا دکھاتا ہے اُتنا چھپاتا بھی ہے۔ میں ناصر کاظمی کو لفظوں میں کیا دکھاؤں؟

اُس نے کسی سے کبھی ذکر نہیں کیا مگر چپکے سے اپنے پیٹ میں کینسر لیے پھرتا رہا ۔ اُس کے معالجوں کو بھی ایک عرصہ تک پتا نہ چل سکا کہ وہ اپنے پیٹ میں کیا چھپائے بیٹھا ہے ۔ یا اگر اُنھیں علم ہو گیا تھا تو وہ بھی پردے ہی ڈالتے رہے ۔ ہم سب باری باری اُس پہ پردے ہی ڈالتے رہے ۔ کبھی اُس کی عسرت پر ، کبھی اُس کی آوارگیوں پر ، کبھی اُس کی لاآبالیوں پر ، کبھی اس کی حسرتوں پر مگر وہ ان سب پردوں کو پھاڑ کر باہر نکل آتا تھا ۔ مگر وہ زمانے سے کب تک لڑتا ؟ آخر خود ہی ایک دن پردے میں چلا گیا ۔ دنیا پہلے کبھی اتنی ویران نہ تھی جو اب دکھائی دیتی ہے :

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سُلگتے ہیں دل کے ویرانے

جس دنیا کو تمھارے حوالے سے دیکھا تھا وہ تو ختم ہوئی ۔ اب ہمارے پاس تمھاری یادوں کا سرمایہ ہے ۔ تمھاری خوب صورت شاعری ہے اور آنسو :

بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

* * *

ناصر کاظمی

فراق گورکھپوری

کم و بیش بیس پچیس برس ہو رہے ہیں جب میں لاہور گیا تھا۔ وہاں "نقوش" کے ایڈیٹر، میرے قابل دوست، طفیل صاحب نے پہلے پہل ناصر کاظمی کا تعارف مجھ سے کرایا۔ میرا مزاج کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ میں لوگوں سے، پہلی ہی ملاقات میں مستقل اور گہرا اثر لیا کرتا ہوں۔ مجھ کو ناصر کاظمی (جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے دل خون ہوتا ہے) سے پہلی ہی ملاقات میں روحانی قرب حاصل ہوگیا تھا۔ ایک سچے، شریف اور پُرخلوص ادیب اور شاعر کی شخصیت ناصر کاظمی کی شخصیت تھی۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے متعدد صحبتوں میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے، پیش پیش رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی سے میری نظر خاص طور سے ان پر پڑی۔ غالباً ان کی پہلی کتاب ''برگِ نے'' طباعت کی آخری منزلوں میں تھی کہ جس کی دو جلدیں انھوں نے نہایت محبت کے ساتھ میرے پاس بھجوائیں۔ ان کے کلام کی دوسری کتاب مجھے اب تک نہیں ملی۔

ناصر کاظمی ہی کے یہ شعر ہیں :

کیا قیامت ہے کہ بے ایامِ گل
ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

تو نے بنجر زمیں کو پھول دیے
مجھ کو اک زخمِ دل کشا ہی دے

ان اشعار کو دیکھتے ہوئے اور ناصر کاظمی کی جواں مرگی کا اثر لیتے ہوئے مجھے کیٹس اور دیگر نو عمر انگریزی شاعروں کی موت پر شیلی کا یہ فقرہ بے اختیار یاد آ جاتا ہے :

The inheritors of unfulfilled renown......

میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر ناصر کاظمی کی عمر وفا کرتی تو وہ ضرور ایک نہایت اچھی جگہ اپنے لیے اردو شاعری میں اور خاص کر اردو غزل میں پیدا کرتے - اے بسا آرزو کہ خاک شدہ - میں عمر بھر کئی بیماریوں کا شکار رہا ہوں اور گزشتہ تیس چالیس برس کی اردو شاعری پر پوری طرح اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکا - مجھے اس امر کی بڑی شرمندگی ہے کہ خود ناصر کاظمی کے کلام کو اس اطمینان سے میں نہیں پڑھ سکا جس کا وہ متقاضی اور مستحق تھا - پھر بھی اتنا اثر میرے اوپر ضرور ہوا ہے کہ ان کی شاعری میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش بالکل ناکام نہیں ہے کہ تخیل اور تصور کا خلوص اشعار میں اپنے آپ کو ڈھال لے - خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں - ناصر کاظمی زندہ رہتے تو ہمیں بہت کچھ دے جاتے - ادب کی میراث تقسیم نہیں کی جا سکتی - ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادبی کارنامے قیامت تک ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوں گے - بلکہ ہم آہنگ رہیں گے - ناصر کاظمی کے لہجے میں وہ کھٹک اور کھنک ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان دونوں میں بسنے والے اپنے دلوں کی دھڑکنیں سنیں گے - یہ کوئی معمولی صفت نہیں ہے —— علالت میں اور کیا لکھوں ——

* * *

تھا ایک اندازِ جنوں یہ بھی

محمد حسن عسکری

ناصر کاظمی کے دوست اور قدر دان اُن کی یاد میں مضامین کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں ۔ غنیمت ہے کہ بعض لوگوں میں شعر و شاعری کا ہوش ابھی تک باقی ہے ۔ ناصر کی شاعری پر محاکمہ نہ تو میرا منصب ہے اور نہ اس وقت مجھے اتنی سہلت دی گئی ہے کہ میں اُن کے دو شعری مجموعے ازسرِ نو پڑھ لوں ۔ خصوصاً شاکر علی صاحب کے انتقال کے دن مجھے یہ بات شدت سے یاد آ رہی ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ جب کچھ لوگ شعر و ادب یا فن کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کرنے کی اُمنگ رکھتے تھے ۔ یہ آرزو اچھی تھی یا بری ، اس سے بحث نہیں ۔ بہرحال — تھا ایک اندازِ جنوں یہ بھی ۔ ناصر کاظمی کو یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی کہ میں اپنی تحریروں میں ''کم سے کم'' کا فقرہ اکثر استعمال کرتا تھا ۔ اُن کی زندگی اور موت سے شاید اس فقرے میں معنی پیدا ہو گئے ہوں ۔ اُن کی شاعری کی نوعیت اور قدر و قیمت سے قطعِ نظر، کم سے کم ، انھوں نے اپنی زندگی تو اسی ایک دُھن میں گزار دی ۔ جہاں تک رات کو سڑکوں پر پھرنا اور چائے خانوں میں بیٹھنا اس دُھن کا ایک لازمی جز کہلا سکتا ہے ، یہ سلسلہ تو اب بھی جاری ہے اور جاری رہے گا ۔ لیکن شعر پڑھنا ، شعر سمجھنے کی کوشش کرنا ، شعر کہنا اور ان سرگرمیوں کو زندگی کے مترادف سمجھنا ، یہ بات شاید اب دوبارہ نظر نہ آئے ۔ ناصر کاظمی جیسے لوگ آخری قسط تھے ۔

چائے خانوں کے طرزِ زندگی نے ناصر کاظمی کو نقصان بھی پہنچایا ہوگا ۔ مثلاً کسی نے اُن سے کہہ دیا کہ فلسفیانہ شعر کہا کرو ۔ یہ میں نہیں کہتا کہ فلسفیانہ شعر کہنا اُن کی دست رس سے باہر تھا ۔ مگر ایسی شاعری

کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے وہ چائے خانہ فراہم نہیں کر سکتا۔ خیر، چائے خانے سے اُنھیں کئی فائدے بھی پہنچے۔ زبان کے معاملے میں سلیقہ مندی تو اُن کے یہاں شروع سے تھی۔ مگر اس خاص طرزِ زندگی نے گفتگو کو اُن کے لیے کتاب پڑھنے کا بدل بنا دیا تھا اور بات سنوار کے کہنے کا شوق بھی اُن میں بڑھا دیا تھا۔ ہمارے بیشتر جدید شعراء کے لیے شاعری محض جذبات یا خیالات کے اظہار کا وسیلہ بن کے رہ گئی ہے۔ لیکن ناصر کاظمی اُن شاعروں میں سے ہیں جو زبان سے بھی لطف لے سکتے ہیں۔ یہ چیز روز بروز کم یاب ہوتی جا رہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہمیں کسی دن یہ کہنا پڑے کہ اس معاملے میں بھی ناصر کاظمی آخری قسط تھے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون سی کتابیں پڑھتے تھے، مگر پرانے اُردو شاعروں نے اپنے اشعار میں اُردو زبان کی جو ادائیں دکھائی ہیں اُس کا عکس ناصر کاظمی کے اُن اشعار میں اکثر جھلکتا ہے جن کا تعلق چاند یا گھاس سے نہیں ہے۔

اُن کی شاعری کا یہی پہلو تھا جس کی وجہ سے ۱۹۴۸ء میں مجھے اُن کا کلام دل کش معلوم ہوا اور میں نے اُنھیں آمادہ کر لیا کہ وہ کسر نفسی چھوڑ کر دو چار غزلیں چھپوا دیں۔ علاوہ ازیں، اُن کے کلام میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کے اجتماعی تجربے کا شدید احساس بھی کم سے کم مجھے نظر آیا۔ اُس زمانے میں میرا خیال تھا کہ ان دو باتوں کی بنا پر دوسرے پڑھنے والوں کو بھی اُن کا کلام پسند آئے گا۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آج کل بھی اُن کا کلام مقبول ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ پڑھنے والے اُن کے اشعار کے کس پہلو سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے کلام پر تنقیدی بحث تو وہی کر سکتے ہیں جو ان معاملات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ کم سے کم مجھے اُن کی شخصیت اور اُن کی شاعری (گھاس کے باوجود) اب بھی محبوب ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ ایسی چیزیں ہماری قوم کو اب بھی محبوب رہتیں، حالانکہ اب تو آخری قسطیں ہی چل رہی ہیں۔

کچھ تمھارے بھی دھیان پڑتی ہے؟

* * *

ناصر کاظمی اور آئیڈیالوجی کا مسئلہ

احمد ندیم قاسمی

ناصر کاظمی کے بعض مداح ، اسے ایک بیکار ، بے مرکز اور بے مقصد زندگی کے ترجمان کی حیثیت میں پیش کرکے یوں خوش ہوتے ہیں جیسے انھوں نے ناصر اور اس کے فن کی بڑی خدمت انجام دی ہے ، حالانکہ اس طرح ، بالواسطہ طور پر ، وہ صرف اپنی ہی خدمت انجام دیتے ہیں کیونکہ ایسا کرکے ان کے اپنے ہی تعصبات کو تسکین حاصل ہوتی ہے - محض ''سو رہو سو رہو'' اور ''صبر کر صبر کر'' کی سی روایتوں کے سہارے ، ناصر کو منفیت اور بے معنویت کا نمایندہ قرار دینا اس کے ساتھ کھلی زیادتی ہے -

میں مانتا ہوں کہ ناصر ادب میں آئیڈیالوجی کا مخالف تھا ، مگر کیا اس کی ایک اپنی منضبط اور واضح آئیڈیالوجی نہیں تھی ؟ اگر وہ کسی آئیڈیالوجی سے --- زندگی اور انسان کے بارے میں کسی غیر مبہم نقطۂ نظر سے --- زندگی کرنے کے ایک معیار اور ایک نظریے سے محروم ہوتا تو وہ اردو غزل میں اپنا وہ منفرد اسلوب کیسے پیدا کر لیتا جو سراسر اس کا اپنا ہے اور اس کی پہچان ہے ؟ فنی اسلوب محض خاص لفظوں ، خاص استعاروں یا خاص علامتوں ہی سے صورت پذیر نہیں ہوتا - حالات و واقعات کے سلسلے میں فن کار کا ذاتی ردِ عمل ، ان حالات سے متعلق اس کا ذاتی رویہ ، اس کا فکر اور اس کا زاویۂ نگاہ بھی اس کے انفرادی اسلوب کی تشکیل کے لازمی عناصر ہیں اور ناصر کی غزل اس کے ہم عصروں سے الگ اسی لیے پہچانی جاتی ہے کہ اس غزل پر ناصر کی آئیڈیالوجی کی چھاپ ہے - ناصر نے ایک بار ادب میں آئیڈیالوجی کی مخالفت میں کہا تھا کہ آخر بانسری کو کس آئیڈیالوجی نے جنم دیا تھا ؟ فقرہ

خوب صورت ہے مگر اس کا جواب نفی میں نہیں ہے جیسا کہ ناصر کا مقصد تھا ۔ اس کا جواب اثبات میں ہے ۔ بانسری کو بھی ایک آئیڈیالوجی ہی نے جنم دیا تھا ، جس طرح تاج محل بھی ایک آئیڈیالوجی ہی کا کارنامہ ہے اور ایٹم بم بھی ایک آئیڈیالوجی ہی کی ایجاد ہے ۔ انسان کی ہر تخلیق کا محرک ایک جذبہ ہوتا ہے ۔ آپ اس جذبے کے حسن یا قبح پر بحث کر سکتے ہیں مگر جذبے کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے ۔ یہ جذبہ کائنات کے بارے میں ، جس کے اہم ترین اجزاء زندگی اور انسان ہیں ، اس شخص کے انفرادی رویے سے پھوٹتا ہے ، اور یہی رویہ وہ آئیڈیالوجی ہے جس سے بعض لوگ اس قدر ایلرجک ہیں اور انہیں یہ سوچنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے کہ اگر وہ ادب میں کسی آئیڈیالوجی کی مداخلت کے مخالف ہیں تو اپنی جگہ یہ بھی ایک آئیڈیالوجی ہی ہے ۔

ناصر اگر مجھ سے پوچھتا کہ بانسری کو کس آئیڈیالوجی نے جنم دیا ، تو میں عرض کرتا کہ لکڑی کے جس ٹکڑے سے بانسری کے موجد نے سُر پیدا کیا تھا ، اس سے وہ مویشی بھی تو ہانک سکتا تھا ، مگر اس نے ایسا نہ کیا ۔ اس نے بانسری بنانے کو ترجیح دی اور یوں اپنی ایک واضح آئیڈیالوجی کا اظہار کر دیا ۔ یہ آئیڈیالوجی کچھ بھی ہو سکتی ہے —— اسے اظہارِ جذبات کہہ لیجیے ، اظہارِ کرب کہہ لیجیے ، اظہارِ مسرت کہہ لیجیے ، انسانی ذہن پر آواز کی شعبدہ کاری کا تجربہ کہہ لیجیے ، انسان کی گونا گوں الجھنوں کو کاٹتی ہوئی روحانی آسودگی کی ایک شعاع کہہ لیجیے —— کچھ بھی کہہ لیجیے مگر یہ تو طے ہے کہ کچھ نہ کچھ تو آپ کو کہنا ہی پڑے گا اور یوں آپ اس کی آئیڈیالوجی کا اعتراف اور اثبات کریں گے ۔ آپ یہ تو یقیناً نہیں کہیں گے کہ کسی شخص سے بانسری کی ایجاد بس سرزد ہو گئی ۔ آپ ایسا کہیں گے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ رہے ہوں گے کہ ہومر اور شیکسپیئر اور غالب اور اقبال سے بھی ان کی شاعری سرزد ہو گئی تھی ۔ لفظوں اور آوازوں اور رنگوں کے شاہکار سرزد نہیں ہوا کرتے ۔ اور چونکہ وہ سرزد نہیں ہوتے اور ان میں فن کار کا ذہن شامل ہوتا ہے ، اس لیے ان کی تخلیق کے پس منظر میں تخلیق کار کا نقطۂ نظر ضرور کارفرما ہوتا ہے ۔ چنانچہ ناصر کی غزل بھی ایک خاص نقطۂ نظر —— ایک خاص نظریے کی پیداوار ہے ۔ یہی آئیڈیالوجی ہے ۔ آئیڈیالوجی صرف

اشتراکیت کو نہیں کہتے - سارتر کی وجودیت بھی ایک آئیڈیالوجی ہے اور میرا جی کی جنسیت بھی ایک آئیڈیالوجی ہے اور ناصر کی "ماضی کی یادیں اور مستقبل کے خواب" بھی ایک آئیڈیالوجی ہی کی پیداوار ہیں - حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے ایک سالانہ جلسے میں ناصر نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا، اس پر میں نے اسی نقطۂ نظر سے تنقید کی تھی اور عرض کیا تھا کہ آپ ادب میں آئیڈیالوجی کی نفی کرنے کے باوجود خود اپنی آئیڈیالوجی کو پوشیدہ نہیں رکھ سکے - سو ''بانسری کو کس آئیڈیالوجی نے جنم دیا تھا'' کا سا بظاہر خوب صورت فقرہ ناصر کے فن کی کلید نہیں ہے -

اسی طرح کے ایک اور فقرے کو بھی ہمارے ادبی حلقوں میں بہت شہرت حاصل ہوئی ہے - مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے بارے میں مشہور ہے کہ جب رائٹرز گلڈ بنانے والوں نے ان سے تعاون کی درخواست کی تھی تو مولانا نے فرمایا تھا کہ پیغمبروں نے بھی کبھی گلڈ بنائے ہیں ؟ تعاون کے طالب اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے حالانکہ وہ مولانا کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کر سکتے تھے کہ قبلہ، اگر پیغمبروں نے گلڈ کبھی نہیں بنائے تو انھوں نے رسالے بھی کبھی نہیں نکالے اور ایک معیاری ادبی رسالہ جاری کرنا اور اسے جاری رکھنا بجائے خود اہلِ قلم کا ایک گلڈ چلانے کے مترادف ہوتا ہے - بہرحال مولانا کا یہ فقرہ بھی ناصر کاظمی کے متذکرہ فقرے کی طرح خوب صورت اور چونکا دینے والا ضرور ہے مگر یہ کسی حقیقت پر نہیں، محض مفروضے پر مبنی ہے -

ناصر پر "شاعری برائے شاعری" کی تہمت دھرنے والے دوست مجھ سے ایک بار پھر خفا ہو جائیں گے کہ میں ناصر کے فن کو آئیڈیالوجی سے آلودہ کرنے چلا ہوں - وہ اس کے کلام میں سے پھول اور چڑیاں اور کبوتر اور ویران حویلیاں اور سُونے رستے تو بڑے اہتمام کے ساتھ چن لائیں گے مگر یہ نہیں سوچیں گے کہ جب ناصر یہ کہتا ہے تو ایک آئیڈیالوجی کے تحت کہتا ہے کہ:

''ادیب کے پاس وسائل نہ سہی، مگر ایک وسیلہ
تو ہے - یہ وسیلہ لفظ کا ہے - یہ ایک سو ایکواں
داؤں ہے --- اور یہ تو وہ داؤں ہے جس نے

فرشتوں کو سجدہ کرا دیا تھا ــــ‘‘

ناصر نے ادیب کی اس زبردست قوت کا اعلان اس صورتِ حال کے زیر اثر کیا تھا جس کے مطابق ناصر کے خیال میں قوم کے بعض افراد نے وسائل خود سمیٹ لیے تھے اور مسائل ادیبوں کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ ناصر اسی صورتِ حال کو بدلنے کے لیے لفظ کا وہ ایک سو ایکواں داؤں استعمال کرنے کی بات کر رہا تھا جس نے فرشتوں سے بھی سجدہ کرا دیا تھا۔ یہ اندازِ فکر ایک آئیڈیالوجی کی پیداوار نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ مثبت اور تخلیقی آئیڈیالوجی ہے، اور ان لوگوں کی آئیڈیالوجی سے سراسر مختلف ہے جو ناصر کو صرف چڑیوں اور کبوتروں کی دنیا میں محدود رکھنا پسند فرماتے ہیں۔

میرا دعویٰ ہے کہ زندگی اور انسانی رشتوں کے بارے میں ناصر کاظمی کا ایک قطعی طور پر واضح نقطۂ نظر تھا، اور اگر وہ دو ٹوک الفاظ میں اس نقطۂ نظر کے وجود کا اعتراف نہ کر پایا، بلکہ ادب میں نقطۂ نظر کی مخالفت تک کر دی، تو یہ اس کی کوئی مجبوری تھی یا اس کے مزاج کی کوئی کمزوری۔ ناصر بڑا شاعر تھا اور ہر بڑے شاعر کی ایک اپنی آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ وہ میر اور غالب اور اقبال ہوں، یا فراق اور فیض اور ناصر ــــ زندگی کے بارے میں ان سب کا اپنا اپنا نظریہ ہے جو ان کے ہر شعر کے پس منظر میں منڈلاتا ہوا مل جائے گا۔ اور پھر ناصر نے اپنی شاعری کے بارے میں یہ تو کہہ ہی دیا تھا کہ وہ ماضی کی یادوں اور مستقبل کے خوابوں کی شاعری ہے۔

ماضی کی یاد ہر انسان کا جذباتی سرمایہ ہوتی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ شاعر ان یادوں کی تخلیقی بازیافت پر بھی قادر ہوتا ہے۔ ماضی کو کس شاعر نے یاد نہیں کیا۔ کسی کے ہاں انفرادی یادیں ہیں تو کسی کو اجتماعی یادوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ اردو شاعری میں اقبال کی شاعری ماضی کی بازیافت کی ایک بلیغ مثال ہے۔ بعض نقادوں نے اس شبے کا اظہار کیا ہے کہ اقبال پورے کے پورے ماضی کو، بلا تخصیص و استثناء، حال اور مستقبل پر مسلط دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ شبہ درست نہیں ہے۔ اقبال نے حال اور مستقبل کے خاص تقاضوں سے کبھی قطع نظر نہیں کیا۔ اس نے ان کی

کبھی نفی نہیں کی بلکہ ماضی کی صرف ان روایات کو، جو اس کی آئیڈیالوجی کے مطابق آج بھی قابلِ تقلید ہیں، زندہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ ناصر کاظمی کا ماضی بھی محض انفرادی نوعیت کا نہیں ہے۔ یہ اس خطۂ ارض کا وہ تہذیبی اور معاشرتی ماضی ہے جو روشن پہلوؤں سے بالکل عاری نہیں ہے اور ناصر اسی روشنی کو یاد کرتا ہے جو کہیں بجھ رہی ہے اور کہیں ڈوب رہی ہے۔ چراغ اور چاند اس کے ہاں ماضی کی انھی بجھتی اور ڈوبتی روایات کی علامتیں ہیں۔

رہے ناصر کاظمی کے مستقبل کے خواب، تو خواب تین طرح کے ہوتے ہیں — خوش گوار، لایعنی اور خوف ناک خواب۔ ناصر نے خوف ناک خواب کبھی نہیں دیکھے کیونکہ اسے یہ خود اعتمادی حاصل ہے کہ بحیثیت شاعر اس کے پاس ایک سو ایکواں داؤں ہے جو معجزے برپا کر سکتا ہے۔ اسے لایعنی خوابوں سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ اس کے ہاں زندگی کا ایک معین مفہوم اور مقصد ہے اور لایعنی خواب صرف وہی شاعر دیکھتے ہیں جو زندگی کو بے مقصد اور بے مفہوم سمجھتے ہیں۔ ناصر صرف خوش گوار خواب دیکھتا ہے اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ خوش گوار خواب دیکھنا ہر شاعر کا حق بھی ہے اور فرض بھی ہے۔ یہ یحییٰ خان کے مارشل لاء کے دن تھے جب میں نے ایک غزل میں ایک شعر کہا تھا:

خدا نکردہ، کسی قوم پر یہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینوں میں

جب کسی قوم کے شاعر خوش گوار خواب دیکھنا ترک کر دیتے ہیں تو وہ شاعر نہیں رہتے بلکہ صرف ایک ایسی مخلوق بن کر رہ جاتے ہیں جو عام لوگوں سے صرف اس لیے مختلف ہے کہ وہ موزوں طبع ہے اور لفظوں کی نشست و برخاست کا ہنر جانتی ہے۔ پھر خوش گوار خواب صرف وہ شاعر دیکھتے ہیں جن کی ایک مثبت آئیڈیالوجی ہوتی ہے اور جو مروجہ زر پرست معاشرے کو سراسر منقلب کر دینے اور اسے اجتماعی افادیت کے تصور کے زیرِ اثر لانے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ ناصر جب یہ کہتا ہے کہ اس کی آداسی منفی نہیں ہے بلکہ اس آداسی سے تو خود آگاہی کے سوتے پھوٹتے

ہیں ، تو ناصر کا معیارِ خود آگاہی مجرد نوعیت کا نہیں رہتا ، ہمہ گیر اور ہمہ اثر حیثیت اختیار کر جاتا ہے - یہی خود آگاہی شاعر کو ایک خوش حال زندگی ، ایک پُرسکون معاشرے اور ایک شاداب تہذیب کے خواب دکھاتی ہے - یہی ناصر کاظمی کی آئیڈیالوجی ہے - اس نے یقیناً اسے آئیڈیالوجی کا نام نہیں دیا ، مگر زندگی اور انسان اور اس کے مستقبل کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر کے سوا آئیڈیالوجی اور ہوتی کیا ہے ! ناصر سے اس قسم کے اشعار اس کی منفرد آئیڈیالوجی ہی کہلواتی ہے :

رہ نوردِ بیابانِ غم ، صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم ، صبر کر صبر کر

تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہہ لے ستم ، صبر کر صبر کر

تیرے قدموں سے جاگیں گے اُجڑے دلوں کے ختن
پا شکستہ غزالِ حرم ، صبر کر صبر کر

شہر اُجڑے تو کیا ، ہے کشادہ زمینِ خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم ، صبر کر صبر کر

یہ محلاتِ شاہی تباہی کے ہیں منتظر
گرنے والے ہیں ان کے علم ، صبر کر صبر کر

دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف ہر طرف
خشک مٹی سے پھوٹے گا نم ، صبر کر صبر کر

لہلہائیں گی پھر کھیتیاں کارواں کارواں
کھل کے برسے گا ابرِ کرم ، صبر کر صبر کر

یار لوگ ناصر کے اس طرح کے اشعار کو تصوّف اور انفعالیت کی طرف لے جائیں تو انھیں کون روک سکتا ہے ، مگر حق بات یہ ہے کہ ناصر محدود شاعر نہیں ہے ، وہ متنوع موضوعات کا شاعر ہے اور زندگی کے حسن کے سینکڑوں پہلوؤں اور اس کی رنگا رنگی کا شاعر ہے ، اور اس حسن

اور اس رنگا رنگی کو سب کے لیے عام کر دینے کی امنگ رکھنے والا شاعر ہے ۔ ناصر کی اس خصوصیت کو گرفت میں لانے کے لیے اس کے قاری کو اپنے ذاتی تعصبات اور اپنے مزاج کے عجز سے ذرا سا اونچا ہو کر شاعر کے الفاظ کی روح کی بلندیوں تک پہنچنا پڑے گا اور یہی وہ کام ہے جسے کرنے پر ناصر کے پیشہ ور مداح ابھی تیار نہیں ہو پائے اور یوں وہ ناصر کی مسلسل حق تلفی کا ارتکاب کیے جا رہے ہیں ۔

*　　*　　*

نئی دنیا کا مسافر

سلیم احمد

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کراچی کے کچھ لوگوں نے جن میں ناصر کے بعض دوست بھی شامل تھے کہنا شروع کر دیا تھا کہ ناصر کاظمی شاعر کی حیثیت سے مر چکا ہے ۔ اتفاق سے انھی دنوں ناصر کاظمی کراچی آ گئے اور کئی روز تک مختلف حلقوں میں گھومتے پھرتے رہے ۔ ایک رات تقریباً ڈھائی بجے تک ہم لوگ کراچی ایئرپورٹ کی روشنیاں دیکھنے اور ناصر کاظمی کی جھلملاتی ہوئی غزلوں کو سننے میں مصروف رہے ۔ پھر ناصر میرے ساتھ گھر آ گئے ۔ اُس وقت ان پر جانے کیوں ایک عجیب سی کیفیت تھی ۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد کچھ چپ سے ہو جاتے ۔ یکایک انھوں نے بالکل ہی خلاف توقع مجھ سے ایک سوال کر دیا ۔ سلیم ! کیا میں نے کبھی کوئی اچھا مصرع کہا ہے ؟ میں چونک پڑا ۔ تمھارا اس سوال سے کیا مطلب ہے ۔ ناصر کو میں نے کبھی جذباتی ہوتے نہیں دیکھا تھا ۔ لیکن اس وقت ان پر ایک رقت سی طاری تھی ۔ سلیم ! اگر مجھ سے شعر نہیں ہو رہا ہے تو کیا لوگ مجھے یہ سوچ کر معاف نہیں کر سکتے کہ شاید میں پھر کبھی کوئی اچھا مصرع کہہ سکوں گا ۔ ناصر کو غالباً اپنے دوستوں کی مہم کی بھنک پڑ گئی تھی ۔ وہ پوری رات ہم دونوں نے یہ سوچتے ہوئے گزاری کہ سچے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی وہ شعر بالکل نہیں کہہ سکتا ، یا کہتا بھی ہے تو بُرا ۔ جو لوگ ہمیشہ ایک سے انداز میں اچھے شعر لکھتے رہتے ہیں ان کی شاعرانہ شخصیت میں کوئی نہ کوئی کھوٹ ضرور ہوتا ہے ۔

ناصر جیسے شاعر میں شعر کہنے کا عمل صرف ذاتی مسئلہ نہیں ہوتا ۔ ایسا شاعر تو شخص سے زیادہ ایک بیرومیٹر ہوتا ہے ۔ وہ شعر نہیں کہتا

تو اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ اس کی ذاتی صلاحیت میں کمی آ گئی - یہ بھی ہوگا - مگر اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں کچھ اور بھی بتا دیتا ہے - ناصر کی شاعری کا بہترین دور ۱۹۵۰ع سے شروع ہوکر بارہ چودہ سال میں ختم ہو جاتا ہے - اس زمانہ میں انھوں نے اپنی بہترین غزلیں کہیں - نقادوں کو متاثر کیا - اور عام پڑھنے والوں میں مقبولیت حاصل کی - اس کے بعد کا دور یا تو آتری ہوئی شاعری کا دور ہے یا پھر نئی راہوں کی تلاش کا - شخصی سطح پر اس کا یہ مطلب تو ظاہر ہے کہ ناصر میں ایک مخصوص قسم کی شاعری کا امکان ختم ہوگیا تھا - لیکن اس کے ساتھ ہی غیر شخصی سطح پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس امکان کے ختم ہونے میں دوسری چیزوں کا کتنا دخل تھا - پتا نہیں میں اپنا سوال واضح بھی کر سکا ہوں یا نہیں - بہرحال ناصر کاظمی کی شاعری کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہوئے شاید ہم کسی واضح سوال تک پہنچ جائیں -

ناصر کی شاعری اور ہجرت کی واردات ہمارے تصور پر ایک ساتھ وارد ہوئی - بلکہ ناصر ہی نے ہمیں ہجرت کے المیہ کو محسوس کرنا سکھایا - ہجرت کے معنی صرف ایک سرزمین کو چھوڑنا نہیں تھا - یہ صدیوں کے انسانی رشتوں کو چھوڑنے اور ایک بالکل نئی صورتِ حال میں ازسرِ نو زندگی شروع کرنے کا مسئلہ تھا - ناصر نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں جو بعض لوگوں کے نزدیک ان کی شاعری کا بہترین دور بھی تھا ، ہمیں یہ احساس دلائے ہیں کہ ماضی کی زندگی اپنے سارے حسن کے ساتھ جل کر راکھ ہوگئی ہے اور ہمیں زندہ رہنا ہے تو اس خاکستر سے نئی زندگی پیدا کرنا پڑے گی - ناصر کو ماضی کی زندگی عزیز تھی - اس نے جلتے ہوئے شہروں اور سلگتی ہوئی بستیوں کا بہت سوگ منایا - مگر اس کے ساتھ ہی یہ ناصر تھا جو شاخوں پر جلے ہوئے بسیروں میں ایک نئی فصلِ گل کا سراغ ڈھونڈھ رہا تھا - بعد میں ناصر کے یہاں جلے ہوئے بسیروں کی واردات اس کی فطرت نگاری کے تجربہ میں ایک نئی صورت اختیار کر لیتی ہے - ناصر کے یہاں فطرت کا احساس کسی تحریک کا حصہ نہیں ہے - وہ فطرت کی طرف اس لیے نہیں گیا کہ مسٹر ورڈز ورتھ کی روایت ہے یا کرنل بالرائڈ صاحب فرماتے ہیں - فطرت کی طرف وہ اس لیے گیا کہ ہجرت کی ایک معنوی جہت فطرت سے دُوری بھی ہے - نئی زندگی جس کا تجربہ ناصر کو ہجرت کے بعد

ہوا، شہر کی زندگی تھی جس میں ناصر کے کبوتروں ، فاختاؤں اور جگنوؤں کی کوئی گنجائش نہ تھی - یہ شہر ناصر کو بہت بھاری پڑا - شاعر کی حیثیت سے بھی اور انسان کی حیثیت سے بھی - میں ناصر کی فطرت نگاری سے بہت خوش نہیں ہوں کیونکہ اردو غزل کی اس روایت میں جس کے بغیر ناصر کا تصور نہیں کیا جا سکتا ، فطرت ، انسانی تعلقات کے ایک حاشیے کے طور پر آئی ہے - لیکن اس میں فطرت کا اپنی جگہ کوئی مقام نہیں ہے - یہاں تک کہ فراق کے یہاں بھی فطرت کا احساس اس شعوری یا نیم شعوری کوشش کا نتیجہ ہے کہ غزل میں ہندو تہذیب کو بھی شامل کیا جائے - بہرحال ناصر کاظمی کے یہاں فطرت نگاری کی کوشش بعض جگہ کچھ مضحکہ انگیزی سی پیدا کرنے کے باوجود کہیں کہیں خوب صورت اور موثر بھی ہے - اور ناصر کے اس تجربے کا حصہ ہے جس کے ذریعے وہ نئی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا - یہیں سے ناصر کاظمی کی شاعری میں اس عنصر کا اضافہ ہوا جسے ڈاکٹر وزیر آغا نے "یادیں" کا نام دیا ہے - ان یادوں کے ذریعے ناصر اپنی اور معاشرے کی نئی پرانی زندگی کو تقابل میں رکھ کر دیکھتا ہے - ہجرت کے بعد ناصر کو نئی زندگی میں کیا ملا - اس کا خلاصہ اس نے جا بجا اپنے اشعار میں پیش کیا ہے - مثلاً وہ غزل جس کا مقطع یہ ہے :

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

یا وہ غزل جس میں اس نے شاعروں کے شہر لاہور کے بجھ جانے کا ماتم کیا ہے - ماضی اور نئی زندگی کا تقابل اس کی کئی اور غزلوں کا بھی موضوع ہے - اور یہ غزلیں ایک بڑے سچے دکھ کا پتا دیتی ہیں - ناصر کی آواز اپنے دور کی سب سے زیادہ دکھی اور اداس آواز ہے - اور بعض اوقات اپنی سچائی سے ہمارے وجود کے سچے تاروں کو اس طرح چھوتی ہے کہ اس کی چوٹ دیر تک دل میں محسوس ہوتی رہتی ہے - ناصر کی اداسی کچی چاندی کی طرح سچی اور خالص ہے - ناصر کاظمی نے اداسی کو شاعرانہ طرزِ زندگی کا استعارہ بنا دیا ہے - اداسی کے بغیر نہ زندگی اپنا جادو جگاتی ہے نہ محبت - اداسی کے معنی ہیں شاعر ہونا یا اس سے بھی آگے بڑھ کر انسان ہونا - یوں ناصر کی شاعری میں اداسی صرف ایک کیفیت

بن کر نہیں آتی بلکہ زندگی کی ایک قدر بن جاتی ہے ۔

خیر ناصر نے یہ تو دریافت کر لیا تھا کہ اس کی شاعری اور زندگی کا اسلوب کیا ہونا چاہیے ۔ لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ زندگی اس اسلوب کی نشو و نما میں مدد کرتی ہے یا اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے ۔ شاعر کو یہ فیصلہ تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ وہ کیسی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ، کیسی شاعری کرنا چاہتا ہے ، لیکن یہ فیصلہ ایک بار ہو کر نہیں رہ جاتا ۔ کیونکہ ہمارے اندر اور باہر بہت سی چیزیں اس فیصلے کے خلاف عمل کرتی رہتی ہیں ۔ اور اس سے ٹکرا کر اس کی صورت بدلتی رہتی ہیں ۔ ان معنوں میں شاعر ہونا اور شاعر رہنا ایک مستقل جہاد کا نام ہے ۔ نئی دنیا کے ہنگامے ناصر کی شاعری اور زندگی دونوں کے اسلوب سے براہِ راست متصادم تھے ۔ زندگی میں اس پر کیا گزری ۔ اور اس کی بے وقت موت میں نئی دنیا کے کون کون سے سفاک اور بے رحم عناصر کام کر رہے تھے ۔ ان کے تو خیال سے بھی خود سمیت ساری دنیا سے نفرت ہونے لگتی ہے ۔ لیکن شاعر کی حیثیت سے ناصر کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ اس زندگی میں اس کی آداسی کا بھی کوئی مقام نہیں تھا ۔ اس زندگی سے ٹکرا کر وہ شعلہ بننے کی بجائے راکھ ہوگیا ۔ تھا ہی وہ اتنا حساس ، اتنا نازک ، اتنا چھوئی موئی سا شاعر ۔ ناصر نے یہ احساس ضرور کر لیا تھا کہ نئی دنیا اس کی شاعری اور شاعرانہ طرزِ زندگی کے درپے ہے ۔ اسی احساس سے وہ کبھی کبھی بہت غصہ میں بولتا ہے :

ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے
گو باغباں یہ کنجِ چمن مجھ سے چھین لے

سینچیں ہیں دل کے خون سے میں نے یہ کیاریاں
کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے

پھر اسی غصہ کی ایک شکل وہ بھی ہے جب وہ دنیا کو پیغمبرانہ انداز میں مستقبل سے ڈرانے لگتا ہے :

زباں سخن کو ، سخن بانکپن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسے گا

نئے پیالے سہی تیرے دور میں ساقی
یہ دور میری شرابِ کہن کو ترسے گا

انھیں کے دم سے فروزاں ہیں ملتوں کے چراغ
زمانہ صحبتِ اربابِ فن کو ترسے گا

لیکن دکھ بھرے غصے کی ان کیفیتوں میں اسے کبھی کبھی خود اعتمادی کی وہ لہر بھی محسوس ہوتی ہے جو کہ ایک شاعر کی سب سے قیمتی متاع ہوتی ہے۔ اس وقت اس کے لہجہ میں ایک بانکپن، ایک زندہ اندازِ تفاخر کی شان پیدا ہو جاتی ہے:

سرِ مقتل بھی صدا دی ہم نے
دل کی آواز سنا دی ہم نے

آتشِ غم کے شرارے چن کر
آگ زنداں میں لگا دی ہم نے

رہ گئے دستِ صبا کملا کر
پھول کو آگ پلا دی ہم نے

کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینۂ نے میں چھپا دی ہم نے

لیکن اس میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ خود ناصر جانتا ہے کہ یہ فتح و کامرانی ایک وقتی سی چیز ہے:

آج تو رات جگا دی ہم نے

نئی دنیا کے خد و خال ناصر کے شعور میں جیوں جیوں زیادہ اجاگر ہوتے گئے، اسے بار بار یہ احساس ہونے لگا کہ وہ تنہا ہے۔ اس کا قافلہ اسے چھوڑ کر کسی اور طرف نکل گیا۔ وہ چین سے سوتی ہوئی بستیوں کے درمیان مارا مارا پھرتا ہے اور اسے کوئی ہم سفر نہیں ملتا۔ اس کے دیار کی سوئی ہوئی زمین ان لوگوں سے خالی ہوگئی ہے جن کی اسے تلاش ہے۔

بازار بند ہیں - راتیں سنسان اور بے چراغ ہیں - تنہا راتوں کا مسافر، اُداس شاعر دیکھتا ہے کہ کوئی گھر سے نہیں نکلتا - اس عالم میں اگر کوئی ملتا بھی ہے تو دل کی بات کرنے یا سننے کے قابل نہیں ملتا کیونکہ اب دلوں میں آگ باقی نہیں رہی - کوئی چیز ہے جو کھو گئی ہے:

خدا جانے ہم کس خرابے میں آ کر بسے ہیں
جہاں عرضِ اہلِ ہنر نکہتِ رائگاں ہے

تنہائی، کس مپرسی، بے حسی اور بے اعتنائی کے اس عالم میں کچھ اُمید تھی تو ان لوگوں سے جو ناصر ہی کی طرح ناصر کے ساتھ دل جلانے کے ہنر کو قائم رکھنے آئے تھے مگر دنیا نے انھیں بھی بدل دیا - اب ان کا عالم بھی معاشرے کے دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں تھا:

بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جا نکلے
یہ ہم سفر مرے کتنے گریز پا نکلے

اب ان سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ناصر
وہ ہم نوا جو مرے رتجگوں میں شامل تھے

انجام؟

کس سے کہوں کوئی نہیں، سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میتِ شہرِ بے کفن

ناصر اس سارے تجربے کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو اُسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کی شاعری اور شاعرانہ طرزِ زندگی کا سب سے بڑا دشمن وہ نظامِ زر ہے جو نئی دنیا نے پیدا کیا - پہلے یہ احساس کچھ ذاتی نوعیت کا ہے - لیکن رفتہ رفتہ ناصر اسے زیادہ گہرائی میں دیکھنے لگتا ہے - ناصر کو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت اور انسان سے جو رشتہ وہ قائم کرنا چاہتا تھا - اُسے اس نظامِ زر نے نا ممکن بنا دیا ہے - یہ نظامِ زر

لوگوں کو آداس نہیں بناتا ۔ بے حس اور سفاک بناتا ہے ۔ ناصر کی شاعری میں آہستہ آہستہ اس نظامِ زر کے وہ پہلو اجاگر ہونے لگتے ہیں جو انسانوں کو اندر اور باہر سے بدل رہے ہیں ۔ دوسروں ہی کو نہیں ، خود ناصر کو بھی ۔ خیر ذاتی حد تک تو ناصر نے ایک خاص موڈ میں یہ دکھ بھرا اعتراف کر لیا کہ :

اب تو خوش ہو جائیں اربابِ ہوس
جیسے وہ تھے ہم بھی ویسے ہو گئے

لیکن اس کے دوسرے پہلو ان اشعار میں دیکھیے :

جنھیں زندگی کا شعور تھا انھیں بے زری نے بجھا دیا
جو گراں تھے سینۂ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر

لشکر ہے نہ پرچم ہے نہ دولت ہے نہ ثروت
ہیں خاک نشینوں کے نشاں اور طرح کے

چند گھرانوں نے مل جل کر کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
باہر کی مٹی کے بدلے گھر کا سونا بیچ دیا ہے

یہ اشعار تعداد میں زیادہ نہیں ہیں اور شاید ان میں ویسی شاعری بھی نہیں ہے جس کی توقع ہم ناصر سے کرتے ہیں ۔ لیکن ناصر کی شاعری کی فضاؤں میں ان سایوں کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ناصر نئی دنیا کی حقیقی صورتِ حال سے واقف ضرور تھا ۔ نئی دنیا ناصر کی شاعری اور شاعرانہ طرزِ زندگی کو مٹانے کے درپے تھی ۔ اور بہت دنوں آداس پھرنے ، تنہائی کا دکھ سہنے اور نکہتِ رائگاں کا ماتم کرنے کے بعد ناصر کی نظر بہرحال اپنے اصل دشمن کو پہچاننے لگی تھی ۔ ناصر کی محسوساتی شاعری میں اتنی توانائی نہیں تھی کہ وہ نئی دنیا کی صورتِ حال کو آئینہ دکھا سکتا ۔ اور شاید یہ بھی درست ہے کہ ”صبر کر صبر کر“ اور ”ہم نفسو شکر کرو“ جیسی خوب صورت غزلوں کے باوجود آسے اس

دنیا سے نکلنے کا راستہ دکھائی بھی نہیں دیتا اور وہ اپنے سارے تجربے کے نچوڑ کے طور پر صرف اتنی بات کہہ سکا :

اک نیا دور جنم لیتا ہے
ایک تہذیب فنا ہوتی ہے

ناصر کی زندگی اور شاعری ہمیں بتاتی ہے کہ نئی دنیا میں سچی تخلیق ناممکن ہے اور سچے فن کار کے لیے میو ہسپتال کے دروازے کے سوا ہر دروازہ بند ہے۔

* * *

ناصر کاظمی : ایک گم گشتہ نوا

مظفر علی سید

ہمارے ادبی ماحول میں کب سے یہ صورتِ حال چلی آتی ہے کہ اپنے درمیان جیتے جاگتے شاعروں میں سے کسی ایک کی شاعری پر بات کرنا خود اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے - مگر کسی مرحوم ساتھی کا کلام بھی 'پل صراط پر چلنے سے کم کا مضمون نہیں - ایک طرف تنقید میں مرثیہ گوئی کا طعنہ تیار ہے تو دوسری طرف شقاوت قلبی کا الزام دھرا ہے - گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل -

پھر بھی آئیے ناصر کاظمی کی یاد میں سستے آنسو بہانے یا ہلکے طعنوں سے ڈرنے کی بجائے ہم اس کا "دیوان" کھول کر بیٹھیں اور "برگِ نے" بھی ساتھ ہی رکھ لیں - پہلے دیوان کی پہلی ہی غزل کو دیکھیں :

آرائشِ خیال بھی ہو ، دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

یوں درد تو زندگی میں قدم قدم پر ملتے ہیں اور ناصر کے یہاں ان کی کون سی کمی تھی مگر وہ درد جس کی ہم خود آرزو کریں ، جو تخیل کی زینت بھی ہو اور کشادگیِ قلب کا باعث بھی ، اس درد بھرے دور میں کمی ہے تو ایک ایسے درد کی - ہمارا زمانہ اس گونا گوں درد کی دولت سے اس قدر محروم ہے کہ روزمرہ کی یکسانیت سے گھبرا اٹھتا ہے :

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ، ایک سی اُمید
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

شاید ہمارے اندر نمو کا احساس کند ہو چکا ہے یا ہم اپنی بے فرصتی میں اپنے حواس کو اتنا موقعہ ہی نہیں دیتے کہ زندگی کا رنگ ، مہک اور

آواز ہماری رگوں میں اتر سکے - حالانکہ یہی واردات ہمارا سب سے نادر تجربہ بن سکتی ہے :

فرصت میں سُن شگفتگیِ غنچہ کی صدا
یہ وہ سخن نہیں کہ کسی نے کہا بھی ہو

اور آخری شعر :

بزمِ سخن بھی ہو ، سخنِ گرم کے لیے
طاؤس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

ان تھوڑے سے شعروں کی مدد سے اتنا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس غزل کا اپنا ایک ٹھاٹ ہے اور لفظوں کے یہ پیٹرن جو بنائے گئے ہیں ایک ہی تجارتی صنعتی سانچے کے ڈھلے ہوئے نہیں ہیں - غزل کا بنیادی پیٹرن یا اس کی زمین غالباً خود ناصر کی نکالی ہوئی ہے اور اس بنیاد پر جو تعمیر اٹھائی گئی ہے اس کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ مستحکم اور باہم پیوست ہے - غزل کے الفاظ بظاہر کچھ ایسے منفرد نہیں لگتے تاہم اصل تمثالی معنوں سے ان کی قربت ، ان کی ترتیب اور بدلتے ہوئے لہجے کی سُرتیاں کسی رائج الوقت ، سکہ بند یا ہموار غزل کی یاد بھی نہیں دلاتیں - یہ وہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو -

کلیدی کلمہ اردو زبان کا ایک معمولی سا دیسی حرف ہے : بھی - اس حرف کو شاعر نے کئی ایک الگ الگ نحوی ترکیبوں میں استعمال کیا ہے اور اس کے باوجود اس کے مختلف مفہوم بول چال کی زبان سے دور نہیں ہونے پائے - ابھی تک ہم نے لفظوں میں مضمر خیالات و احساسات کی بات نہیں کی اس لیے کہ ان کو ظاہری شکلوں سے جدا کرکے نہیں دیکھا جا سکتا - کلمات کے مابین پائے جانے والے در و بست کو اپنی شخصیت میں وارد ہونے دیا جائے تو شاعر کی باطنی واردات تک پہنچنا دشوار نہیں ہوگا -

ایک سا غم ، ایک سی امید ، عمر گزارنے کا ایک ہی طور اس کے لیے اطمینان بخش نہیں ہو سکا - مگر وہ ان کو چھوڑنا یا کسی اور غم ، کسی اور امید کسی اور طریقے سے بدلنا بھی نہیں چاہتا - اس کو یہ دنیا بھی چاہیے اور جنت بھی - حقیقت بھی چاہیے اور تخیل بھی - دونوں میں انتخاب اس کے لیے مشکل ہے مگر وہ انتخاب سے پہلو چرا کر حرص کا مظاہرہ بھی

نہیں کرتا ۔ صرف مناسبت اور موافقت کی آرزو کرتا ہے ۔ سخن کے لیے بزم اور طاؤس کے لیے مرغزار لازم و ملزوم ہیں ۔

ناصر کا شمار اُن لکھنے والوں میں نہیں کیا جا سکتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ طاؤس ہریالی کا بدل ہے یا طاؤس بولتا ہو تو جنگل خود بخود ہرا ہو جاتا ہے یا ہرا نہ بھی ہو تو ہرا لگنے لگ جاتا ہے ۔ اس کے لیے فن اور زندگی ، حسن کاری اور واقعیت باہم مربوط ہوئے بغیر اپنی اپنی ہستی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں ۔

بزمِ سخن کا وجود اور جنگل کا ہرا ہونا ایک دوسرے کی تمثال ہیں ۔ ناصر کاظمی جس نے اپنی زندگی میں چند ایک ادبی مجلے نکالنے کے علاوہ ایک وقت میں محکمۂ زراعت کا رسالہ بھی ترتیب دیا تھا اور جس نے مرتے مرتے لاہور کی چڑیوں اور درختوں کو سلام بھجوایا تھا ، اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ تمام کلچر ایگری کلچر کی کوکھ سے نکلتا ہے ۔ اگرچہ اپنے ہم عصر زمین پرستوں کے برعکس وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اپنے آپ نہیں نکلتا بلکہ اس وقت نکلتا ہے کہ جب انسانی اجتماع اس میں اپنے تخیل کا گرم جنین داخل کرے ۔

اسی توافق اور تلازم کا نام غزل کی اصطلاح میں وصل ہے اور اس کی غیر موجودگی کا نام فراق ۔ اب ناصر کی ایک پوری غزل دیکھنے کا وقت ہے ۔ "برگِ نے" اور "دیوان" میں بھی دس دس بارہ بارہ غزلیں ایسی ہیں جو مفصل اور قریبی مطالعہ طلب کرتی ہیں ۔ ہم یہاں ایک ایسی غزل پڑھتے ہیں جس کی ردیف ہے "شامِ فراق" ۔ یہاں ردیف دُہرا کام کرتی نظر آتی ہے یعنی ایک چیز کا نام ہے جو گفتگو کا مرکز ہے اور اس کے علاوہ ایکشن کے تسلسل میں وقت کا تعین بھی کرتی ہے ۔ نحو کی اصطلاح میں کہا جائے تو شامِ فراق اسم بھی ہے اور ظرفِ مکاں بھی :

چراغ بن کے وہی جھلملائے ، شامِ فراق
بچا لیے تھے جو آنسو برائے شامِ فراق

کدھر چلے گئے وہ ہم نوائے شامِ فراق
کھڑی ہے در پہ مرے سر جھکائے شامِ فراق

پلک اُٹھاتے ہی چنگاریاں برستی ہیں
بجھی ہے آگ سی کیا زیرِ پائے شامِ فراق

یہ رینگتی چلی آتی ہیں کیا لکیریں سی
یہ ڈھونڈتی ہے کسے سائے سائے شامِ فراق

کبھی یہ فکر کہ دن کو بھی منہ دکھانا ہے
کبھی یہ غم کہ پھر آئے نہ آئے شامِ فراق

وہ اشکِ خوں ہی سہی دل کا کوئی رنگ تو ہو
اب آ گئی ہے تو خالی نہ جائے شامِ فراق

بجھی بجھی سی ہے کیوں چاند کی ضیا ناصر
کہاں چلی ہے یہ کاسہ اُٹھائے شامِ فراق

یہ غزل جس قسم کے سلوک کی مستحق ہے اس کا تعلق محض بولنے اور سننے سے نہیں بلکہ پوری محویت کے ساتھ پڑھنے سے اس کی تہیں نمایاں ہو سکتی ہیں - موضوع کے مشاہدے اور مطالعے میں محو ہو کر شاعر نے ایک مجرد چیز کو جس جس طرح مجسم کیا ہے اس میں ایک حرکت سی پیدا ہو گئی ہے اور محض سننے سے یہ خفیف حرکت صرف کہیں کہیں محسوس ہوتی ہے :

یہ ڈھونڈتی ہے کسے سائے سائے شامِ فراق

بعض جگہ ایک بات دو طریقے سے ادا کی جا سکتی ہے مگر بولنے میں ایک وقت پر ایک ہی ادائیگی منتخب کرنی پڑتی ہے :

کہاں چلے گئے وہ ہم نوائے شامِ فراق

وہ لوگ جو شامِ فراق کی ہم نوائی کیا کرتے تھے یا وہ لوگ کہ جدائی کی شام کو میرے ہم نوا ہوا کرتے تھے - شاید دونوں معنی بیک وقت مراد لیے جا سکتے ہیں - صرف ایک خرابی ہے کہ فارسی ترکیب کے اندر ہم نوا کا کلمہ اردو کی طرح جمع کے لیے استعمال ہوا ہے اور اگرچہ یہ خرابی دونوں صورتوں میں رہے گی مگر اجتماع کو ایک وحدت سمجھا جائے تو اظہار کی یہ لغزش حُسن میں تبدیل ہو جاتی ہے -

شامِ فراق سے فراق گورکھپوری کی وہ طویل غزل یاد آ سکتی ہے

جس کی ردیف صرف فراق ہے - اس کے علاوہ فراق صاحب کی ایک آدھ لفظی خصوصیت مثلاً کسی شے کا جھلملانا اور بجھا بجھا سا ہونا بھی اس نفوذ کی جانب اشارہ کرتا ہے جو ''برگِ نے'' کی کئی ایک غزلوں میں زیادہ بین طور پر موجود ہے -

مگر شامِ فراق والی غزل میں جو ناصر کے پختہ اور منفرد دور کا کلام ہے یہ نفوذ بھی نمو کے مراحل سے گزرا ہوا نظر آتا ہے - ناصر کے یہاں آنسوؤں کا چراغ بن کے جھلملانا محض ایک جذباتی تاثر ہی نہیں ، ایک تصویر بھی ہے - اسی طرح چاند کی ضیا بجھی بجھی سی لگنا محض ایک احساساتی بیان ہی نہیں بلکہ اس کا اگلے مصرع کے تجسم سے بڑا محکم تعلق ہے - شاید یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ جب یہ غزل "نیا دور" میں شائع ہوئی تھی تو "بجھی بجھی" کی جگہ "اڑی اڑی سی ہے کیوں چاند کی ضیا ناصر" تھی - اس سے جہاں ناصر کی ہنرمندانہ نظر ثانی کا سراغ ملتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بعد میں فراق کا یہ اثر تخلیقی سطح پر قبول کر لیا گیا ہے -

فراق کے زیر اثر آنے سے پہلے ناصر کاظمی کبھی "شعلۂ طور" اور کبھی "بال جبریل" کی پیروی کرتا نظر آتا ہے - ''برگِ نے'' کی ابتدا میں دونوں قسم کی شہادتیں موجود ہیں - ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی اور مایوس نہ ہو اداس راہی - یوں لگتا ہے کہ شروع میں مشاعرے کی غزل اس کو ایک جانب کھینچتی تھی اور اقبال کے پیغمبرانہ لہجے کی نفسیاتی ضرورت دوسری طرف - مگر فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ کون سی کشش کے سامنے سپر ڈال دی جائے اور کون سی رغبت کا مقابلہ کیا جائے - یہاں آ کر فراق اور فراق کے علاوہ حفیظ ہوشیار پوری مرحوم کہ جنھوں نے شاید لاہور میں سب سے پہلے فراق کو دریافت کیا تھا ، ناصر کی مدد کرتے ہیں اور اس پر واضح ہوتا ہے کہ اقبال کی تاریخ سازی اور جگر کی نغمگی کو ایک ساتھ لے کے بھی چلا جا سکتا ہے -

یاد پڑتا ہے کہ "برگِ نے" کی اشاعت سے پہلے دوستوں میں اس بات پر خاصی بحث چلی تھی کہ مشاعرے والی چند ایک غزلیں کتاب میں شامل

کی جائیں یا دوسری ''عنفوانیات'' کی طرح قلم زد کر دی جائیں ۔ اس وقت دوستوں کی رائے عامہ یہی تھی کہ اس دور کی منتخب غزلیں باقی رکھنا بہتر ہوگا مگر ناصر اپنے ایک شعر کی مقبولیت سے کچھ چڑنے سا لگا تھا ۔

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

دوستوں کا خیال تھا کہ چونکہ یہ شعر خود ناصر سے زیادہ مشہور ہو گیا ہے اس لیے وہ اس سے بھڑکنے لگ گیا ہے حالانکہ دوست کی ضرورت محسوس کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جو مشاعرے میں پیش نہیں آ سکتا ۔

بہرحال نوجوانی میں ناصر کاظمی مشاعروں میں سٹار ویلیو رکھنے والے شاعروں میں شمار ہوتا تھا ۔ اب سٹار ویلیو کے ساتھ مصیبت یہ ہے ایک بار حاصل ہو جائے تو حساس آدمی کو میریلین منرو بنا کے رکھ دیتی ہے اور میریلین منرو فن کار بننے کی کوشش کرے تو آرتھر ملر بھی اس کو خود کشی کرنے سے روک نہیں سکتا ۔ ہم نے اپنے زمانے میں اور بھی چند ایک مشاعرہ لوٹنے والوں کو دانشوروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتے دیکھا ہے ۔ مگر ناصر کے یہاں شروع سے ایک ایسا اضطراب تھا جو اس کو کسی بھی حالت میں مشاعرے کے ہوائی بلبلوں پر گزارا نہ کرنے دیتا ۔

پھر بھی مشاعرے سے دانش وری کے خارزار میں داخل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا ۔ رسمی تعلیم نامکمل رہ گئی ہو ، مغرب کے ادب اور جدید علوم و فنون سے تقریباً بے نیازی کی فضا میں پرورش پائی ہو اور عربی ، فارسی سے گہری آشنائی کا موقع بھی نہ مل سکا ہو تو کون دانش ور ہے جو ایسے ادیب کو شک کی نظر سے نہ دیکھے گا ۔ یہ درست ہے کہ اکثر حالتوں میں تنقید کی شکی نظر دغا نہیں دیتی ۔ مگر ناصر جب ہجرت کی منزلِ شب طے کرنے کے بعد دوبارہ لاہور آیا تو اپنے دامن میں انسانی وارداتیں سمیٹ کے لایا :

اُنھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

آہ وہ خلوتوں کے سرمائے
مجمعِ عام میں لٹائے گئے

———

کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب ان دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں

تخلیقی جبلت کا تسلط تھا یا اقبال اور فراق کے فیضان سے حاصل شدہ عصری شعور یا ادبی تربیت اور ذاتی تجربے کا ملاپ — بہرحال اس وقت کے دانش وروں نے ، جو اُٹھتے بیٹھتے ریں بو اور ورلین اور پاؤنڈ ، والیری اور سینٹ جون پرس ، رلکے اور سٹیفن جورج ، لورکا اور نرودا کا ورد کیا کرتے تھے ، چائے خانے میں آنے والے اس پریشان حال غزل گو کی میزبانی شروع کر دی ۔ شاید آن میں کوئی ایسا "ریفارمر" بھی ہو جس نے ایک حساس آدمی کو دانش ور بنانے کا فریضہ خود ہی اپنے ذمے لے لیا ہو یا ناصر کاظمی کو اپنی جگہ ایسی صحبت میں کچھ نہ کچھ حاصل بھی ہوا ہو مگر جہاں تک مجھے یاد ہے ناصر نے ایسی صحبتوں میں یا تو اشعار سنائے یا خاموشی اختیار کر لی اور جب بولنا شروع کیا تو اپنی ذاتی دلچسپیوں اور خوابوں کے بارے میں گفتگو کی ۔ دانش وروں نے اس کو ہمیشہ ایک دلچسپ آدمی سمجھا اور اُس نے دانش وروں کو شک کی نظر سے دیکھا ہو تو دیکھا ہو ۔

پھر بھی "برگِ نے" کے نصف آخر کی غزلوں میں جدید تمثالی تحریک کا جو واضح پرتو نظر آتا ہے وہ بغیر کسی وجہ کے نہیں ہو سکتا ۔

ناصر کے بارے میں یہ داستان بہت عام ہے کہ وہ بے حد کاہل آدمی تھا اور کسی اور کی لکھی ہوئی تحریر کا مطالعہ کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا ۔ اگرچہ ادھر اُدھر سے سُنی سنائی معلومات کو وہ اتنے اعتماد کے ساتھ ذاتی دریافت بنا کے پیش کر سکتا تھا کہ بڑے بڑے شک کرنے والے پہلو بدلنے کے سوا کچھ بھی ردِعمل ظاہر نہ کر سکیں ۔ شاید ایک آدھ

وفا دار ساتھی اس کو نہایت خاموشی اور رازداری سے گہرے علمی مطالعے کا شوقین بھی ثابت کر دکھائے مگر واقعہ یہ ہے کہ آج سے بیس پچیس برس پہلے بھی وہ اس قدر ناخواندہ نہیں تھا جتنے آج کے دانش ور ہوتے ہیں اور اتنا عالم فاضل بھی نہیں تھا کہ بقول شخصے کیمبرج اور ہارورڈ یونیورسٹی کے اساتذہ کو درس دے سکے۔

اس نے اردو زبان کے بڑے شاعروں کو ایک سچے طالب علم کی طرح پڑھا تھا۔ اقبال، غالب، انیس، نظیر اور سب سے زیادہ میر تقی میر کو۔ اس پر ان شاعروں کے علمی اور تاریخی تناظر میں داخل ہونے کا الزام تو شاید نہ لگ سکے مگر اس کی پسند نا پسند کا جبلی معیار اور سطح کی مشکلات کے بارے میں اس کا اندازہ غضب کا تھا۔ ان سب شاعروں نے (شاید نظیر کو چھوڑ کر) اس کی غزل پر کچھ نہ کچھ اثرات ضرور چھوڑے ہیں مگر یہ اثرات تقلید کی بجائے حوالے کا ایک تہذیبی فریم ورک مہیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ میر بھی، جس کو اردو ادب کی تاریخ میں ناصر کاظمی سے زیادہ شاید ہی کسی نے پڑھا ہو اور جس کا بہترین انتخاب ناصر کے سوا کوئی نہ کر سکتا تھا، ناصر کی شہ رگ سے ہمیشہ قریب رہتے ہوئے بھی کسی ایک جگہ کم ہی نظر آتا ہے۔

پھر بھی ہمارے دانش ور کہیں گے کہ اتنا محدود مطالعہ ہمارے عصر کا شعور پیدا کرنے کے لیے سخت ناکافی ہے اور ہمارے اکثر شاعروں کی عام ذہنی سطح کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ مگر ناصر کے پاس اس محدود مطالعے سے لامحدود منفعت حاصل کرنے کی اہلیت بھی تھی کہ جس کے عناصر میں اس کی روشنیِ طبع، اہلِ علم و ادب کی صحبتیں، بحث مباحثہ اور ان سے بڑھ کر زندگی کا تجربہ شامل ہے۔ اس نے اپنے محدود مطالعے سے جتنا فیض اٹھایا ہے کاش کہ ہمارے وسیع المطالعہ دانش ور اپنے علم و فضل کے ایک ہزارویں حصے کو اتنا بارور بنا سکتے۔

پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ میر پر اس کا مقالہ دلچسپ اور مفید اشاروں کے باوجود پورے شاعر کا محاصرہ نہیں کر سکا۔ خواجہ میر درد پر اس کا مضمون جو "آب حیات" کے ایک جملے کی تاویل میں لکھا گیا ہے

آخر میں ایک نمائشی قسم کی دانش وری کا شکار ہو جاتا ہے ۔ ناصر کی نثر سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ غالب سے اس کا رشتہ زینت محل سے آگے اور اقبال سے اس کا رابطہ کبوتروں سے اوپر بھی جا سکتا ہے ۔ اس کے جواب میں شاید کوئی کہے کہ ناصر کی یہ تحریریں اخباروں کے خاص ایڈیشنوں کا خلا پُر کرنے اور اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے لکھی گئی تھیں اور اب ان کو بھول جانا ہی بہتر ہوگا ۔ مگر سوچیے تو سہی کہ کیا یہ ایک تہذیبی حادثہ نہیں ہے کہ ناصر جیسا شاعر نثر لکھنے بیٹھے تو ایک بہت بڑے موضوع کی ایک نہایت ہی جُزوی تفصیل کے بارے میں محض لچھے دار گفتگو کرکے رہ جائے ۔

ناصر کاظمی کی نیک نامی یا اس کے ردِ عمل میں اس ٹیبل ٹاک کا بھی کچھ حصہ ضرور ہے جو اس نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ریکارڈ کرائی تھی اور جو "خوشبو کی ہجرت" کے عنوان سے رسالوں میں چھپ بھی چکی ہے ۔ شاید اس کے ذریعے ہجرت کے تجربے کو دانشورانہ رنگ و روغن عطا کرنا مقصود تھا مگر کسی مربوط معاشرتی ادبی نقطۂ نظر کو پیش کرنے کا یہ طریقہ تقریباً اسی قدر موثر ہو سکتا تھا جس قدر کہ آج کل ٹیلیوژن پر علمی مباحثے ہوتے ہیں ۔

یہ سب باتیں جاننا ضروری ہے تاکہ ناصر کی غزل کے سلسلے میں ہم کسی پا در ہوا نظریے کا شکار نہ ہو جائیں ۔ خود ناصر کی غزل میں تنقیدی نوعیت کے اتنے اشارے اور تعلیاں موجود ہیں کہ اس کے حقیقی ادبی نقطۂ نظر کی تلاش لازم ہو جاتی ہے ۔ اس نے بار بار رفتگاں کی بات کی ہے اور نمو کے مختلف مراحل میں تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ کی ہے ۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم کلاسیکی سرمائے کے ساتھ اس کے بدلتے ہوئے رویے کو سمجھ سکیں ۔

اقبال نے کہا تھا : "میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ۔" اقبال کے بعد جو اردو ادیبوں کی نسل سامنے آئی اس کے یہاں یہ دردِ سر مرے سے تھا ہی نہیں کیونکہ وہ ادب اور زندگی کو محض سامنے کی چیز سمجھتے تھے ۔ تاریخ کا پہاڑ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا ۔ یہاں تک کہ

فراق گورکھپوری کو ایک نحیف سی فریاد کرنا پڑی :

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

چنانچہ ناصر کاظمی کو از سرِنو رفتگاں کی تلاش کا سفر اختیار کرنا پڑا :

صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری
نگاہِ شوق کس منزل سے گزری

ہر نفس شوق بھی ہے منزل کا
ہر قدم یادِ رفتگاں بھی ہے

اور یہ مشہور شعر :

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ
اور کچھ دن پھرو اُداس اُداس

کسی نقاد نے ناصر کی اس تلاش کو ایک احساساتی تناظر کا نام دیا ہے ۔ میں شاید اس کو ایک تہذیبی فریم ورک بنانے کی خواہش کہوں مگر اس سے پیشتر کہ یہ خواہش پرستش کا روپ دھار لے ، اس جستجو پر اعتراض ہونے لگتا ہے :

آ کے منزل پہ آنکھ بھر آئی
سب مزہ رفتگاں نے چھین لیا

اور دیوان کا یہ شعر جس میں عصری واقعیت کے سامنے رفتگاں کی تلاش بے معنی ہو جاتی ہے :

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اُگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت

مگر رفتگاں کی اصطلاح ادب اور زندگی دونوں کے سلسلے میں استعمال ہو سکتی ہے ۔ بعض جگہ ایک معنی مراد ہیں ، بعض جگہ دوسرے اور چند ایک جگہ دونوں ۔ کہیں اس سے وہ گم شدگان مراد ہیں جو ہجرت

کے دوران مفقود الخبر ہو گئے اور کہیں وہ پرانے ساتھی ہیں جو اب کبھی نہیں مل سکیں گے ۔ ان کا تذکرہ رفتگاں کے لفظ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے اور شاید ذاتی نقصان کی شدت اس دانشورانہ اصطلاح کی محتاج بھی نہیں :

کانٹے چھوڑ گئی آندھی
لے گئی اچھے اچھے پھول

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

اب وہ دریا ، نہ وہ بستی ، نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

عالمِ خواب میں دکھائے گئے
کب کے ساتھی کہاں ملائے گئے

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

اور ایک پوری غزل —— سفرِ منزلِ شب یاد نہیں ۔

یہ اشعار زیادہ تر "برگِ نے" سے لیے گئے تھے ۔ دیوان میں یہ جذبہ ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے ۔ اب ان ساتھیوں کا رونا ہے جن کو عصری واقعیت کی لہریں اپنے ساتھ بہا کر ناصر کی شبینہ محفلوں سے دور لے گئیں یا ان نئے ہم سفروں کا شکوہ ہے جو اس پرانے شب گزیدہ کا زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دے سکتے ۔ اب ناصر کی زبان پر دنیا کے منحرف ہو جانے کا شکوہ ہے اور نئے ادبی ماحول سے ناگواری کا اظہار ، ساتھ ہی اپنے انفرادی کمال کا دعویٰ جو پہلے سے زیادہ بلند بانگ ہو گیا ہے :

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اُگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

بازار بند ، راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

داتا کی نگری میں ناصر
میں جاگوں یا داتا جاگے

کس سے کہوں کوئی نہیں، سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میت ِ شہر بے کفن

میکدہ بجھ گیا تو کیا ، رات ہے میری ہم نوا
سایہ ہے میرا ہم سبو ، چاند ہے میرا ہم سخن

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا مثال ِ گرد ِ سفر گیا وہ

ظاہر ہے کہ دیوان میں اُس نے اپنے پرانے ساتھیوں کو ٹوٹ کے یاد کیا ہے ، کبھی اُن کو بے وفائی کا الزام دیا ہے اور کبھی ہمت ہار دینے کا۔ شاید ناصر کے ہم سفر تھے ہی ایسے مگر اس کے یہاں بھی اس صورت ِ حال پر افسوس زیادہ ہے اور سوچ بچار بہت کم۔ بہرحال اس قسم کی عصری واقعیت کا سراغ شاید ہی کہیں ملتا ہو جو انسان کو انسانوں سے جدا کر کے رکھ دیتی ہے۔

طباعت اور مطالعہ ، خط و کتابت اور کبھی کبھار کی ملاقات سے ناصر کو اطمینان نہیں ہو سکا ، یہ بھی ایک تہذیبی المیہ ہے کیونکہ جب ادب اور زندگی کا تہذیبی رشتہ موجود نہ ہو تو ذاتی وفاداریوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور حساس انسان جملہ معاشرتی عوامل کو ذاتی حوالے سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کبھی ناصر کے لفظوں میں رگ ِ عصر کا لہو خود بخود بولتا تھا اور اس کو یہ بات جتانے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ آزادی کے وقت اور اس کے فوراً بعد اس کی آواز میں ہم سب کا تجربہ شامل تھا مگر کچھ دیر کے بعد جب مسائل پیچیدہ ہونے لگے تو نئی دنیا کے ہنگاموں میں

پرانی آوازوں کے دب جانے کا امکان پیدا ہوا ۔ ناصر کو اس تبدیلی کا احساس تھا :

اک نیا دور جنم لیتا ہے
ایک تہذیب فنا ہوتی ہے
کچھ نئے لوگ آنے والے ہیں
گرم اب شہر میں خبر ہے یہ

مگر اس کے باوجود کہ وہ اپنے آپ کو نئے سانچے میں ڈھالنے پر تیار نہ تھا اس کو یقین تھا :

نئے پیالے ترے دور میں سہی ساقی
یہ دور میری شرابِ کہن کو ترسے گا

اس کو خبر تھی کہ بعد میں آنے والے اسے فراموش نہیں کر سکیں گے :

آتی رُت مجھے روئے گی
جاتی رُت کا جھونکا ہوں

ربع صدی کی تحریری زندگی ، جو صبح آزادی سے لے کر سقوطِ مشرقی پاکستان تک ہماری اجتماعی زندگی کے متوازی چلتی ہوئی نظر آتی ہے ، اس ربع صدی کا حاصل ہے یا محض اس کا سایہ ہے ۔ یہ فیصلہ ہم سب کو کرنا ہے اور اجتماعی طور پر کرنا ہے ۔ میرے یا کسی اور کے کہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا جب کہ اصل مسئلہ یہ ہو کہ ہم تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں اس میں کسی قسم کے فنی کمال کے تسلیم کیے جانے کی گنجائش بھی ہے یا نہیں ۔

ہم ناصر کاظمی اور اس کے فنی کارنامے کو حرفِ غلط کی طرح فراموش بھی کر سکتے ہیں ، دیکھنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہم اپنی اجتماعی شخصیت کے بھی منکر تو نہیں ہو جائیں گے کیونکہ ناصر کا سب سے بڑا کمال اس بات میں مضمر ہے کہ اس کے کلام میں ہماری تاریخ کی صدیاں بولتی ہیں اور ہماری تہذیبی اقدار اس کے اشعار میں مجسم بن کر سامنے آتی ہیں جب کہ معروف تر شاعروں کے یہاں اس تاریخ اور تہذیب سے کوئی سروکار نہیں پایا جاتا :

رہ گئے دستِ صبا کمہلا کر
پھول کو آگ پلا دی ہم نے

آتشِ گل ہو کہ ہو شعلۂ ساز
جلنے والوں کو ہوا دی ہم نے
کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینۂ نے میں چھپا دی ہم نے

لگتا ہے کہ جس نوا کو اس نے تاریخ کی صدیوں سے نکال کر اپنے ساز میں آتارا تھا وہ پھر سے گم ہو چکی ہے۔ مگر اس کی ذمہ داری ناصر پر عائد ہوگی یا ہم سب پر؟

* * *

آداس شاعر ، اجنبی مسافر

آفتاب احمد

ناصر کاظمی سے میرے تعلقات کی ایک قدرِ مشترک فراق صاحب کی شاعری بھی تھی ، برسوں مہینوں گزر جاتے مگر جب بھی ملاقات ہوتی ہم دونوں فراق کے اشعار یاد کرتے اور ایک دوسرے کو سناتے ۔ ناصر سے میری آخری ملاقات اس کے انتقال سے سات آٹھ دن پہلے ہوئی اور عجیب بات ہے کہ اس ملاقات میں فراق صاحب کا ذکر نہ آیا ۔ آخر جب میں رخصت ہونے لگا تو ناصر نے مجھے روک لیا اور پھر بے ساختہ فراق کا یہ شعر پڑھا :

ابھی باتیں بہت کرنی ہیں تم سے
ابھی کچھ ہیں مئے و مہتاب باقی

اور اس کے بعد اس غزل کا مطلع سنایا :

یہ مانا زندگی ہے چار دن کی
بہت ہوتے ہیں یارو چار دن بھی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب سب کو اور خود ناصر کو بھی معلوم تھا کہ اس کی زندگی کی شمع دھیرے دھیرے بجھ رہی ہے ۔ مگر اس کے باوجود یہ اشعار پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی ، زندگی سے لگاؤ کی چمک ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس واقعہ میں ناصر کی شاعری کی پوری داستان بند ہے ؛ وہ اس لیے کہ اس شاعری نے زندگی کی طلب اور زندگی سے محرومی کے احساس کی باہمی کشا کش اور آویزش ہی سے جِلا پائی تھی ۔ ناصر نے بارہا اپنے آپ کو آداس شاعر کہا ہے ۔ واقعی وہ کتنا غمگین ، کتنا آداس اور کتنا تنہا شاعر تھا ۔ ناصر کے پہلے

مجموعۂ کلام "برگِ نے" کی پہلی غزل کا مطلع ہے :

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اور آخر کے تین شعر ہیں :

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمھارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصر نے یہ اور اسی قبیل کے بہت سے دوسرے اشعار سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں کہے ہوں گے مگر آپ ذرا ان کے لہجے ، ان کی جذباتی کیفیت ، ان کے صوتی اثرات پر غور کیجیے - کیا یہ کسی نوجوان شاعر کے اشعار معلوم ہوتے ہیں ؟ ان سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر پر "جوانی کی راتیں جوانی کے دن" آئے ہی نہیں - وہ تو نو عمری ہی میں بوڑھا ہوگیا - اس عمر کے شاعروں کی شاعری میں عموماً ایک مخصوص قسم کی رومانیت اور کچھ

دست بر سینہ نظر بر لب بامے دارم

والی کیفیت ، کچھ ایک بے نام سی سرخوشی و سرمستی پائی جاتی ہے مگر ناصر کے ہاں یہ سب کچھ سرے سے ناپید ہے - اس کی طبیعت پر شروع ہی سے ایک اداسی چھائی ہوئی ہے - ایک گھنگھور اداسی ، ایک کڑی تنہائی ——— وہ خود حیران ہے :

یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی

ابھی میں نے ناصر کی پہلی غزل کے کچھ اشعار پیش کیے تھے - ان کا جو رنگ ہے ، یہی رنگ کم و بیش اس کے تمام کلام کا ہے - ناصر کا

دوسرا مجموعہ "دیوان" میر کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے :

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا !

اس مجموعے کی آخری غزل ہے :

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس غزل میں ناصر نے آخری بار وہ سب کچھ کہہ کے رکھ دیا ہے جو وہ عمر بھر کہنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس میں زندگی سے مایوسی بھی ہے اور زندگی کی حسرت اور تمنا بھی، رات کی تاریکی کا احساس بھی ہے اور اس صبح کا انتظار بھی جو اپنے ساتھ نئے قافلے لانے والی تھی اور جو آ نہیں چکتی۔ اس غزل میں ناصر کو ساحلوں پہ گانے والوں، کشتیاں چلانے والوں، روشنی دکھانے والوں، دوستی نبھانے والوں، نئی عمارتیں بنانے والوں اور اکیلے اداس گھروں میں دیا جلانے والوں کی یاد آتی ہے۔ مختصر یہ کہ اسے ان لوگوں کی یاد آتی ہے جو زمین کا بوجھ اٹھانے کا عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ زمین کا بوجھ اٹھانا انسانیت کی میراث ہے لہٰذا ناصر کے دل میں ان لوگوں کے لیے قدر و منزلت ہی کا نہیں شاید کچھ رشک کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ اداسی اور تنہائی جو ناصر کی شعری شخصیت کا خاصہ بن گئی تھی، اس ازلی نا آسودگی سے متعلق ہے جو حیات و کائنات اور اس زمین و آسمان کے درمیان انسان کی بے بسی پر غور و فکر کرنے کے بعد جنم لیتی ہے اور جس کا اظہار یونانِ قدیم سے لے کر آج تک دنیا کے بڑے بڑے شاعروں اور فلسفیوں کے ہاں کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے۔ میرے خیال میں ناصر کی اداسی اور تنہائی بلاواسطہ اس کے احساسِ اجنبیت سے پیدا ہے۔ جس طرح اس نے اپنے آپ کو اداس شاعر کہا ہے اسی طرح اس نے اپنے آپ کو بے نوا، اجنبی مسافر بھی کہا۔ یہ اس لیے کہ وہ مقام و وقت دونوں لحاظ سے اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا تھا۔ وقت کے لحاظ سے یوں کہ وہ ماضی کے کسی عہد کا آدمی تھا اور قسمت کے ہاتھوں حال کے سپرد کر دیا گیا تھا اور مقام کے لحاظ سے یوں کہ تقسیم کے سبب اسے وطن سے بے وطن ہونا پڑا۔ لاہور جو

اب بھی اس کا وطن تھا اور جس سے وہ تقسیم سے پہلے یعنی طالب علمی کے زمانے سے آشنا تھا اب بھی موجود تھا :

شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت اور اپنے وطن کے مستقل چھٹ جانے کا ایسا چرکہ اس کے دل پر لگا تھا کہ لاہور سے مانوسیت میں بھی اجنبیت کا پہلو برقرار رہا اور اس کے دل کی کلی یہاں کبھی نہ کھلی :

ترے شہر طرب کی رونقوں میں
طبیعت اور بھی گھبرا رہی ہے

مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا

ناصر نے ہجرت کو محض ذاتی تجربے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس فراواں مخلوق کے تجربے کی حیثیت سے محسوس اور بیان کیا ہے جو مشرقی پنجاب کے اضلاع سے خاک و خون کے ایک وحشت ناک سیلاب سے گزر کر آئی تھی ، وہ خود بھی اس مخلوق کا ایک فرد تھا ۔ ناصر نے "برگِ نے" کے دیباچے میں کہا تھا کہ آج کا شاعر "ایک نئی آواز پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس کے اپنے گرد و پیش اور اس کے اپنی زمین و آسمان سے بھی علاقہ رکھتی ہو" — اور پھر یہ بھی کہ "دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن بھی سکتی ہے یا نہیں" — میں سمجھتا ہوں کہ ناصر کے ۱۹۴۷ع سے ۱۹۴۹ع کے اشعار میں ہجرت کے اجتماعی تجربے ، بے نشان ، بے منزل قافلوں کے سفر اور عام تباہی اور ویرانی کی جتنی اثر انگیز تصویریں نظر آتی ہیں ، ان کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی ۔ کم سے کم اس دور کی شاعری میں ناصر کی آواز واقعی اپنے گرد و پیش ، اپنے زمین و آسمان اور ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی آواز بن گئی تھی :

او مرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا

خاک اُڑاتے ہیں دن رات
میلوں پھیل گئے صحرا

فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا

نہ جانے کہاں لے گئے قافلے
مسافر بڑی دور جا کر ملے

جہاں کوئی بستی نظر آ گئی
وہیں رُک گئے اجنبی قافلے

اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے

اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشنِ جم منائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر
خار و خس کی طرح بہائے گئے

دیتے ہیں سُراغ فصلِ گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جا لیے ہیں ڈیرے

جنگل میں ہوتی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے
وہ دیکھا ہے جہاں دیکھا نہ جائے

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غمِ صد کارواں دیکھا نہ جائے

در و دیوار ویراں شمع مدھم
شبِ غم کا سماں دیکھا نہ جائے

ہجرت کے تجربے نے ناصر کو اس حد تک اس لیے متاثر کیا اور اس لیے وہ اس کی جان کا روگ بن گیا کہ اس تجربے میں مقام و وقت دونوں سے ناصر کی دوری اور اجنبیت کا احساس بیک وقت جمع ہو گیا تھا۔ اگلے وقتوں اور پرانی صحبتوں کی یادیں ناصر کی شاعری کا اندوختہ بن کر رہ گئی تھیں۔ یہ اجنبی مسافر تمام عمر مقام و وقت کی ایک دنیا میں کھڑا مقام و وقت کی ایک دوسری ہی دنیا کے خواب دیکھتا رہا:

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

اب کی فصلِ بہار سے پہلے
رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں اب تمھیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

دھیان کے آتش دان میں ناصر
بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے!

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

چمن در چمن وہ رمق اب کہاں!
وہ شعلے شفق تا شفق اب کہاں

کراں تا کراں ظلمتیں چھا گئیں
وہ جلوے طبق در طبق اب کہاں

بجھی آتشِ گل اندھیرا ہوا
وہ اُجلے سنہرے ورق اب کہاں

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اُس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے!

مدت ہوئی کہ سیرِ چمن کو ترس گئے
گل کیا غبارِ بوئے سمن کو ترس گئے

اس عہدِ نو میں قدرِ متاعِ وفا نہیں
اس رسم و راہِ عہدِ کہن کو ترس گئے

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر نگر نگر
کہاں کھو گیا مرا قافلہ کہاں رہ گئے مرے ہم سفر

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی اُنھیں کہ آسمان کھا گیا

اس اجنبیت کے احساس کے ساتھ ساتھ ناصر کے درد و غم اور اداسی و تنہائی کا ایک اور محور ذاتی زندگی میں نارسائی اور محرومی کا احساس بھی تھا کہ جیسے زندگی اس کے پاس سے گزر گئی ہو - اسے اگر خوشی کے چند لمحے میسر بھی آئے تو وہ اتنے مختصر اور اتنے گریز پا تھے کہ ان کا حاصل محض چند یادوں کے سوا کچھ نہیں :

کم فرصتیٔ خوابِ طرب یاد رہے گی
گزری جو ترے ساتھ وہ شب یاد رہے گی

سینے میں امنگوں کا وہی شور ہے اب تک
وہ شوخیٔ یک جنبشِ لب یاد رہے گی

پھر جس کے تصور میں برسنے لگیں آنکھیں
وہ برہمیٔ صحبتِ شب یاد رہے گی

گو ہجر کے لمحات بہت تلخ تھے لیکن
ہر بات بعنوانِ طرب یاد رہے گی

شاید اسی نارسائی اور محرومی کی وجہ سے تلخی بلکہ خود رحمی کی ایک ہلکی سی لہر بھی ناصر کے کلام میں ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہے :

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اُداس کرکے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے ادھر اُدھر کے مجھے

ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا
یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہلِ دنیا نے

اُمیدِ پُرسشِ غم کس سے کیجیے ناصر
جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

حرام ہے جو صراحی کو منہ لگایا ہو
یہ اور بات کہ ہم بھی شریکِ محفل تھے

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

اے دیدہ ور و دیدۂ پُرنم کی طرف بھی
مشتاق ہو لعل و زر و گوہر کے تو دیکھو

بے زادِ سفر ، جیب تہی ، شہر نوردی
یوں میری طرح عمر کے دن بھر کے تو دیکھو

مرا تو خوں ہوگیا ہے پانی ستم گروں کی پلک نہ بھیگی
جو نالہ اُٹھا تھا رات دل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

اسی ذاتی نارسائی اور محرومی کا ایک پہلو نا قدری کا احساس بھی تھا ۔ یہ اس لیے کہ ناصر کو اپنے کمالِ فن پر ناز تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خلش بھی کہ :

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

یاد کیجیے کہ اس نے تیس بتیس برس کی عمر میں وہ غزل کہی تھی کہ جس کا ایک قطعہ بند اس شعر سے شروع ہوتا ہے :

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

اور اس شعر پر ختم ہوتا ہے :

ہم نے محفوظ کیا حُسنِ بہار
عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے

اپنی نے نوازی پر یہ ناز کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں ۔ اور اگر اس نے نوازی کا صلہ عسرت و کلفت کے طویل اور صبر آزما ماہ و سال ہوں تو پھر خود ناصر کی زبان میں :

بے زاد سفر ، جیب تہی ، شہر نوردی
یوں میری طرح عمر کے دن بھر کے تو دیکھو

اس شعر میں تلخی کا جو احساس ابھر آیا ہے وہ تو بہت بعد یعنی عمر کے کافی دن یوں بھر لینے کے بعد کی بات ہے مگر ناصر غریب کی تو شروع ہی سے یہ مشکل تھی کہ :

سائے کی طرح مرے ساتھ رہے رنج و الم
گردشِ وقت کہیں راس نہ آئی مجھ کو

چنانچہ اس نے بہت پہلے عین جوانی کے عالم میں کہہ دیا تھا :

پہنچے گور کنارے ہم
بس غمِ دوراں ہارے ہم

یہ بھی عرض کر دوں کہ ناصر کے اس قسم کے اشعار محض سخن آرائی نہیں ہیں اس لیے کہ وہ ''غم برائے شعر گفتن خوب است'' کا قائل نہیں تھا ۔ ناصر بڑا پُرخلوص اور سچ بولنے والا شاعر تھا اور وہ اپنے احساس و ادراک کو جھٹلانا نہیں جانتا تھا ۔ زندگی واقعی اس کے لیے ایک بوجھ بن چکی تھی اور اس تھکی ہاری شخصیت اور بے کل طبیعت کو مستقل سکون اور امن و اماں کی تلاش تھی ۔ نیند کی اتنی شدید خواہش شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں ملے :

بس اب تو ایک ہی دُھن ہے کہ نیند آ جائے
وہ دن کہاں کہ اُٹھائیں شبِ فراق کے ناز

اور نیند اُس کی دسترس سے باہر تھی :

دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا
سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو

نہ معلوم اس نے کتنی راتیں تاروں کا سفر دیکھتے دیکھتے گزار دیں - ناصر کی اکثر غزلوں میں آواز اور لہجے کی خواب آفریں کیفیت اور غنودگی ؛ رات کے اونگھتے منظروں سے ، سنسان راستوں سے ، خامشی کے بوجھ سے چور در و بام سے اس کی گہری دل بستگی ؛ اگر اس کی نیند کی شدید خواہش کا اظہار نہیں تو کیا ہیں - ایک پوری غزل میں ناصر نے ان منظروں کی نسبت سے اپنے آپ کو لوری دے دے کر سلانے کی کوشش کی ہے - اس غزل کا مطلع ہے :

دن ڈھلا رات پھر آ گئی سو رہو سو رہو
منزلوں چھا گئی خامشی سو رہو سو رہو

قدرت نے اسے کن نعمتوں اور کن صلاحیتوں سے نوازا تھا مگر زندگی نے اُسے کن صعوبتوں سے دو چار کر دیا - ناصر کے آخری زمانے کی اس غزل میں یہ احساس بڑے درد مند انداز سے ظاہر ہوا ہے :

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

ایک مستقل آداسی اور تنہائی ، زندگی سے دوری اور اجنبیت ، اپنی ذاتی نارسائی اور محرومی کا احساس ناصر کے ہاں مزاج کی ایسی کیفیت ہے جو اس کی شاعری پر کہرے کی مانند چھائی ہوئی ہے - کبھی کبھی تو یہ گماں گزرتا ہے کہ یہ کیفیت اس کے تخلیقی جوہر کے لیے ایک پیر تسمہ پا بن کر رہ گئی ہے اور اس کی وجہ سے اس کی شاعری میں یکسانیت اور اک سُراپن پیدا ہوگیا ہے - مگر ذرا غور کیجیے تو احساس ہونے لگتا ہے کہ ناصر نے غم کی شاعری تو بہت کی ہے مگر غم سے پیار کبھی نہیں کیا بلکہ غم کو ہمیشہ زندگی اور اپنے درمیان حائل سمجھا :

دم گھٹنے لگا ہے وضع غم سے
پھر زور سے قہقہہ لگاؤ

اس کو تو عمر بھر یہ شکایت رہی کہ :

دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

اور اسی وجہ سے زندگی سے اس کا ربط اور لگاؤ اور بھی گہرا ہوگیا۔ "طرب" وہ ایک لفظ ہے جسے مختلف صورتوں میں ناصر نے بڑے حسرت آمیز اور والہانہ انداز سے باندھا ہے۔ کون جانے کہ اس کے ترسے ہوئے دل میں طرب اور نشاط کی کتنی طلب رہی ہوگی۔ یہ تو ایک لفظ کی بات ہوئی۔ ناصر کے ہاں موجودات کے حسن کا احساس جس انداز میں ملتا ہے وہ اور کہیں مشکل سے نظر آئے گا۔ صحرا، جنگل، پہاڑ، دریا؛ درخت، سبزہ، پھول، خوشبوئیں، آوازیں، چاند، ستارے، جگنو، پپیہے، آہو، صبح و شام کے بولتے رنگ اور بدلتے موسموں کی گرمی و خنکی۔ غرض وہ کیا کیا چیز ہے جو ناصر کو عزیز نہیں اور جسے وہ اٹھا کے دل میں نہیں رکھ لینا چاہتا۔ مثالیں تو اس قسم کے اشعار کی بے شمار ہیں مگر ایک غزل دیکھیے کہ جس میں خاص طور پر ناصر نے کائنات اور فطرت کے مظاہر سے اٹھنے والی نواہائے راز کی محرمی کی ہے :

سازِ ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سن

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سن

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سن

ہے یہی ساعتِ ایجاب و قبول
صبح کی لَے کو ذرا غور سے سن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سن

برگِ آوارہ بھی اک مُطرب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سن

رنگ منت کشِ آواز نہیں
گل بھی ہے ایک نوا غور سے سن

خامشی حاصلِ موسیقی ہے
نغمہ ہے نغمہ نما غور سے سن

آئینہ دیکھ کے حیران نہ ہو
نغمۂ آبِ صفا غور سے سن

شاید فطرت کی نواہائے راز کی محرمی کے فیض ہی سے ناصر کو کبھی کبھی سرشاری کے وہ لمحے بھی نصیب ہو جاتے ہیں جن میں وہ سوچتا ہے :

مایوس نہ ہو اُداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبح گاہی

چلے تو ہیں جرسِ گل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

چلو کہ برف پگھلنے کی صبح آ پہنچی
خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارا

چلے چلو انہی گمنام برف زاروں میں
عجب نہیں یہیں مل جائے درد کا چارا

ہمیں وہ برگِ خزاں دیدہ ہیں جنھیں ناصر
چمن میں ڈھونڈتی پھرتی ہے بوئے آوارہ

فکرِ تعمیرِ آشیاں بھی ہے
خوفِ بے مہرئی خزاں بھی ہے

خاک بھی اُڑ رہی ہے رستوں میں
آمدِ صبح کا سماں بھی ہے!

پھر کسی صبح طرب کا جادو
پردۂ شب سے ہویدا ہوگا

گل زمینوں کے خنک رمنوں میں
جشنِ رامش گری برپا ہوگا

پھر نئی رُت کا اشارا پا کر
وہ سمن بُو چمن آراء ہوگا

گل شبِ تاب کی خوش بو لے کر
ابلقِ صبح روانہ ہوگا

پھر سرِ شاخِ شعاعِ خورشید
نگہتِ گل کا بسیرا ہوگا

یہ بجا کہ آج اندھیر ہے ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے
جو خزاں کے خوف سے خشک ہے وہی شاخ لائے گی برگ و بر

آپ نے دیکھا کہ یہ اشعار ناصر کے عام رنگِ شاعری سے کتنے مختلف ہیں ۔ مانا کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں اور یہ کہ ایسے اشعار ناصر کی شعری شخصیت کے مستقل پہلوؤں کی نمائندگی نہیں کرتے مگر ان سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسی شخصیت میں آمید افزا ، حیات پرور اور طربیہ شاعری کے کتنے امکانات چھپے ہوئے تھے ۔ یہ امکانات اگر پوری طرح آبھر آتے تو ناصر کی شاعری کیا سے کیا ہو جاتی ! خود ناصر کو یہ احساس تھا کہ اے کاش زمانہ اسے کچھ فرصت دیتا کیونکہ :

ابھی وہ رنگ دل میں پیچاں ہیں
جنھیں آواز سے علاقہ نہیں

ابھی وہ دشت منتظر ہیں میرے
جن پہ تحریر پائے ناقہ نہیں

یہ اندھیرے سلگ بھی سکتے ہیں
تیرے دل میں مگر وہ شعلہ نہیں

اصل بات ناصر نے تیسرے شعر میں کہی ہے ۔ دل کا شعلہ حسن حیات کی تمثیل ہو یا تخلیقی جوہر کی ، سوال تو اس کے چھوٹے پن اور بڑے پن کا ہے ۔ اس کی لو اگر مدھم ہے تو فقط اپنی چمک دکھائے گی ۔ اگر تیز ہے تو اندھیروں کو روشن کر دے گی ۔ اسی سے ناصر اور میر کی شاعری کا فرق ظاہر ہوتا ہے ۔ ناصر کے ہاں زندگی کی طلب اور زندگی سے محرومی کے احساس کی باہمی کشاکش اور آویزش نے جو جذب و اثر بلکہ نشتریت پیدا کر دی ہے اس ہی کی وجہ سے اس پر میر کا سایہ پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ ناصر میر کا نام لیوا تھا اور وہ اس سے بہت حد تک متأثر بھی تھا (اور موجودہ دور کے شاعروں میں وہ فراق سے بھی متأثر تھا) مگر اس کا ایک اپنا رنگ ہے جو میری نہیں خالصتاً ناصری ہے ۔ ناصر کے دل کا شعلہ میر کے دل کا شعلہ نہیں ۔ جو لوگ ناصر کو میر کے مقابلے میں لاتے ہیں وہ دونوں سے زیادتی کرتے ہیں ۔ ان کو شاید یہ احساس نہیں کہ اس کوشش میں وہ ناصر ہی کا قد چھوٹا نہیں کر رہے بلکہ میر کی قد آوری سے بھی اغماض برت رہے ہیں ۔

ناصر بڑے دکھے ہوئے دل کا شاعر تھا لیکن چونکہ اس نے اردو کی کلاسیکی روایت سے اکتساب فیض کیا تھا اس لیے اس کے جذبے اور آواز میں وہ روک تھام ، وہ ٹھہراؤ بلکہ وہ وقار بھی ہے جو ایک پختہ تہذیبی روایت میں پلے ہوئے مزاج کی نشانی ہے ۔ ناصر کو الفاظ اور اظہار و بیان کے دوسرے اسالیب پر وہ قدرت بھی حاصل تھی کہ جس کی بدولت اس کے کلام میں ایک رچی ہوئی احتیاط اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی بھی ہے ۔ یہ باتیں اس کے کسی اور ہم عمر و ہم عصر کی شاعری میں نظر نہیں آتیں ۔

شاعری میں تو ناصر نے جو کچھ بھی کہا ہو مگر زندگی میں اس نے غم کو کبھی اپنے آپ پر مسلط نہیں ہونے دیا ۔ اس نے ساری عمر محنت سے روزی کمائی اور جملہ فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کیے ۔ اس نے نہ کبھی دوستوں کا گلہ کیا نہ زمانے کی شکایت ۔ زندگی میں اس کا چہرہ ہمیشہ متبسم رہا ۔ ہاں شاعری میں کہ جہاں دل کا معاملہ کھلتا ہے ، اس کی

چشمِ تر چھپائے نہیں چھپتی - اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ زندگی میں اس نے ایک مہذب انسان کی اس تہذیبی ذمہ داری کو بھی قبول کر رکھا تھا کہ اسے اپنی افسردگی سے انجمن کو افسردہ کرنے کا کوئی حق نہیں - یہ بھی ناصر کی طبیعت کی سلامت روی کا ایک پہلو تھا - وہ اپنا بوجھ خود اٹھانے کا قائل تھا - دوسروں کے لیے کسی لحاظ سے بارِ خاطر ہونا اسے گوارا نہ تھا -

" برگ نے " کے دیباچے کا آخری جملہ ہے "نالہ محفلیں برہم نہیں کرتا ، نالہ آفریں پہ جو کچھ بھی گزری ہو اگر اس کی فریاد فن کے سانچے میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ پکار ہے -" ناصر کی فریاد سراسر نغمہ ہے ، دھیما ، پرسوز اور دل گداز - اگر میں اس کے بارے میں اسی کی زبان میں یہ کہوں تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ :

خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم ، نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں ، مرے تو دل میں اُتر گیا وہ

* * *

ناصر کاظمی مرحوم کا آخری مجموعۂ کلام

منیر نیازی

عجیب بستیاں تھیں جن سے جدائی کی آداسی نے ہمیں شاعر بنا دیا۔ چھوڑے ہوئے گھروں کی یاد نے کبھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ ہجرت میرا اور ناصر کاظمی دونوں کا مشترک تجربہ تھی۔ ایک پرانے گھر سے بچھڑنے کا ملال اور نیا گھر نہ ملنے کا غم۔ پرانی دل کش، تحفظ اور ہونے کا احساس دینے والی یادوں کے بل پر آیندہ کی تشکیل کی خواہش۔ ناصر کاظمی کی شاعری انہی یادوں اور خوابوں کا بیان ہے۔ اُس کی شاعری کے بنیادی احساس کو میں اس طرح جانتا ہوں جیسے کوئی اپنے دل کے زخم سے دوسرے کے دل کے زخم کو جانتا ہے۔

ناصر کی "برگِ نے" اور "دیوان" دونوں کتابیں دو بستیوں کے خیالوں اور ملالوں کی کتابیں ہیں۔ ایک بستی کی محفلیں، رسوم و رواج، اس کے در و دیوار، اس کے بن، گل، زمینیں، دریا، اس کے آسمان پر چڑھتے اور دمکتے چاند، اس پر گزرے ہوئے موسم اور اس فضا میں کسی انگشتِ حنائی کے اشارے اور پھر اس سے ہجرت اور ایک دوسری بستی کا سنسان اور اجنبی پن کہ جس میں ناصر اپنی چھوڑی ہوئی بستی کے شاعرانہ عکس کا جویا اور اس کے ظہور کے لیے دعا کرتا دکھائی دیتا ہے:

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

"برگِ نے" کی یہ بات "دیوان" میں بھی موجود ہے :

کوئی صورت آشنا اپنا نہ بیگانہ کوئی
کچھ کہو یارو یہ بستی ہے کہ ویرانہ کوئی

شہر اُجڑے تو کیا ، ہے کشادہ زمینِ خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

چُھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں
سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تری یادیں

او پچھلی رُت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں

چین سے بیٹھنے نہیں دیتی
موسمِ یاد کی اُداس ہوا

میں تو بیتے دنوں کی کھوج میں ہوں
تُو کہاں تک چلے گا میرے ساتھ

مگر "دیوان" کی شاعری "برگِ نے" کی شاعری سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ "برگِ نے" کی آداسی "دیوان" میں گھرے ملال کی صورت اختیار کر گئی ہے ۔ عارضی تنہائی علیحدگی کی شکل میں بدل گئی ہے ۔ "برگِ نے" میں تازہ جدائی کی کیفیت ہے کہ جس میں مراجعت ، دوبارہ وصال کے امکانات اور کھو کر پھر پا لینے کی امیدیں ہیں ۔ پر "دیوان" میں "برگِ نے" کے ہلکے ہلکے سروں کی موجودگی کے ساتھ ساتھ ملال کا رنگ زیادہ گھرا اور دعاء کا انداز زیادہ واضح اور نمایاں ہوگیا ہے ۔ اسے اس کے

کلام اور فکر کی پختگی ہی کہا جا سکتا ہے ۔ مگر مضمون وہی آغازِ عشق والے ہی رہے ہیں ۔ سطحی ذہن کے سیاست دانوں کی بدولت اس ملک کا جو حشر ہوا اور اس کے شہروں میں جس قسم کا منتظم ذہن پیدا ہوا اس غیر حساس اور غیر رفیق ذہن کے سامنے شاعر کا جواب دہ ہونا ہولناک عذاب تھا کہ جس کا اثر ناصر کی سوچ اور اس کے اظہار پر پڑا ۔ سو دشمن معاشرے سے مفاہمت کے خیال ، انا کے مجروح ہونے کا کبر —— جو کہ ابتدا کی شاعری میں نہیں تھا ، ''دیوان'' میں ہے ۔ ''برگِ نے'' والے بنیادی احساس پر اس اضافے کا مضمون ''دیوان'' میں سو رنگوں میں باندھا گیا ہے ۔

کچھ رنگ دیکھیے :

عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اُٹھانے والے کیا ہوئے

———

جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سرِ شام
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تری یادیں

———

پیارے دیس کی پیاری مٹی
سونے پر ہے بھاری مٹی

دکھ کے آنسو سکھ کی یادیں
کھاری پانی کھاری مٹی

———

رات اندھیری ہے تو اپنے دھیان کی مشعل جلا
قافلے والوں میں کس کو کس کی پروا ہے نہ پوچھ

———

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو ، سورج کرن کو ترسے گا

جنہیں زندگی کا شعور تھا انھیں بے زری نے بجھا دیا
جو گراں تھے سینۂ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر

کس سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میتِ شہر بے کفن

زندہ ناصر کاظمی

جیلانی کامران

(۱)

ناصر کاظمی کی پہلی برسی (۱۹۷۳ع) کے موقعہ پر ایسے مضامین پڑھنے اور سننے میں آئے جن میں ناصر کاظمی کے شعری مقام کو اس زمانے میں رائج اصولوں کی روشنی میں سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں طبقاتی استحصال اور خارج کی مادی ترتیب کے رشتے کو پس منظر کی بجائے تخلیقی اصول اور محلِ وقوع کی بجائے شعری مقصد قرار دیا گیا تھا۔ ناصر سے اُس کے ایسے تنقید نگاروں کا تعلق کچھ اتنا قریبی تھا کہ ایسی تنقید نگاری شاعری کی بجائے ناصر کی سوانح عمری سے زیادہ متاثر تھی اور ناصر کی طبعی زندگی کے نشیب و فراز سے اُس کی شاعری کے گوشے تشریح پائے تھے۔ نثری مزاج اور شعری مزاج کا فرق ایسے تنقیدی مضامین میں کھل کر نمایاں ہوا تھا۔ نثری مزاج شاعری میں پیرا فریس کی تلاش کرتا ہے اور شاید اسی لیے شاعری کی بجائے شاعر کی زمینی زندگی سے نتائج اخذ کر کے تنقیدی معیار قائم کرتا ہے۔ اور اس طرح سوانح عمری اور شاعری دو متضاد اقداری نظام کی پیروی کرتے ہوئے شاعر کے جس انسانی مزاج کو نمایاں کرتے ہیں وہ تنقید نگاروں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے میں شاید کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ سوانح عمری اور شاعری کے باہمی رشتے سے جو وجودی اور نظری شے برامد ہوتی ہے اُس کی نشان دہی ادبی فکر اور تنقید کے لیے غالباً زیادہ قیمتی ہے۔ اس وجودی اور نظری شے کو ہم سب جانتے ہیں اور اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس شاعری میں انسان

دکھائی دیتا ہے اور اُس شاعری میں دل دھڑکتا ہے تو ہم اُسی وجودی اور نظری شئے ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں یہ وجودی اور نظری شے ایک ایسے شخص کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے جو مستقل طور پر لڑکپن اور اوائل جوانی کی سرحد پر کھڑا ہے۔ لڑکپن اُسے دیکھنا سکھاتا ہے اور اوائل جوانی اُسے تڑپنا سکھاتی ہے۔ لیکن لڑکپن کے محسوساتی اجزاء زیادہ با اثر ہیں اس لیے تڑپ فلسفۂ مرگ کے قریب آنے کی بجائے، پانے، چاہنے اور سمو جانے کی بے تابی میں بدل جاتی ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری سے برابر اُبھرتا ہوا یہ حسیاتی نظری وجود وہ متحرک شے ہے جسے شاعر نے مختلف زاویوں، مختلف حالات اور مختلف بصری رابطوں کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اور اس طرح ہست کو جو زمانے کی محتاج ہے ماورائے ہست میں بدل دیا ہے کہ جہاں کائنات ہر ظہور کے ساتھ ایک نیا منظر اور ایک نئی بے تابی دیتی ہے۔ ناصر کاظمی اگر عام محاورے میں ہست کا شاعر ہوتا تو زمانہ اُس پر حاوی ہو جاتا اور یوں وہ شے جو لڑکپن اور اوائل جوانی کے رشتے سے برآمد ہوتی ہے باقی نہ رہتی، نابود ہو جاتی۔ ناصر کاظمی کی عظمت اس میں ہے کہ جب زمانہ ہمارے فانی جسموں پر حاوی ہو جائے گا اور ہمیں ہر چیز مانوس ہو جانے کے بعد بے کار دکھائی دے گی اُس وقت وہ ہمیں اُس مقام پر بلائے گا جہاں لڑکپن اور اوائل جوانی کی سرحد ملتی ہے اور جہاں گفتگو کرتی ہوئی کائنات بے نقاب ہوتی ہے! لیکن شاید گفتگو کرتی ہوئی کائنات کے ساتھ تعارف جدید معاشرے کے فرد کی ضرورت نہیں ہے۔ ناصر کاظمی کی عظمت یہ ہے کہ وہ لفظ کے ذریعے گفتگو کرتی ہوئی کائنات کے ساتھ اپنا تعارف کرتا ہے! اردو شاعری میں ناصر کاظمی سے پہلے کائنات خاموش تھی۔ ناصر کاظمی نے کائنات کو گفتگو سے آشنا کیا۔ اور اس طرح فلسفے کے اُس عظیم المیے کو باطل قرار دیا جو ذہن اور جسم کے انقطاع پر یقین رکھتا تھا۔ جس کے مطابق معروض اور موضوع میں غیریت حائل تھی۔ ناصر کاظمی کی شاعری نے انسانی اکائی کے ٹوٹتے ہوئے رشتے کو جوڑنے میں جس اصول کا استعمال کیا ہے اُسے ہم اُس کی شاعری میں ہر مقام پر برابر محسوس کرتے ہیں۔ اور یہ اصول موضوع کی جانب سے معروض کی طرف پھیلنے کا اصول ہے اور جسم کے حوالے سے کائنات کے اندر بسنے اور

کائنات کے ساتھ گفتگو کا اصول ہے - ناصر کاظمی شاعری کے جس گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اُس میں امراء القیس اور حافظ کے نام آتے ہیں - عرب اور عجم کی ذہنی و فکری روایت ناصر کاظمی کے لفظوں میں دوبارہ زندہ ہوئی ہے -

(۲)

آردو شاعری کے ماضی قریب کو غزل کی آزمائش کا زمانہ کہا جا سکتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہماری تہذیب ، مغربی فکر سے دوچار ہوئی ہے ، غزل پر سختی کے دنوں کی ابتدا ہوئی ہے - اور ۱۸۵۷ع کے بعد سے ہر نسل نے غزل کو اپنی تخلیقی جدوجہد کے ذریعے اپنے زمانے میں نیا اعتماد اور نیا مقام دیا ہے - پچھلے تیس برسوں کے دوران غزل پھر ایسے ہی امتحان سے دوچار ہوئی تھی اور غزل کے مستقبل کے بارے میں تشویش انگیز سوال آٹھائے گئے تھے - نظم کی مقبولیت نے غزل کے لیے جو دوراہا پیدا کیا آس پر نہ صرف غزل کے تخلیقی مستقبل کا انحصار تھا بلکہ غزل کی پوری روایت کو بھی فکر کے اعتبار سے مشکل میں ڈال دیا تھا - اور آج جب ہم پچھلے تیس برسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے کہ ناصر کاظمی کے ذریعے غزل نے ایک نیا اعتماد اور نیا مقام حاصل کیا ہے - ناصر کاظمی نے ہماری نسل کے لیے غزل کو قابلِ قبول اور قابلِ اعتبار ٹھہرایا اور اس طرح اپنے زمانے میں اس امر کی شہادت دی کہ غزل شعری طور پر شاید کبھی متروک نہیں ہو سکتی - ناصر کاظمی کی یہ شہادت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ادبی اور فکری ادارے کے طور پر غزل کی افادیت مسلّم ہے - اگر ایک ادارے کی حیثیت سے غزل کی اہمیت ثابت ہے تو ہماری تہذیب کے دوسرے ادارے بھی ویسے ہی تخلیقی اور جان دار ہیں جیسے غزل اس دور میں ثابت ہوئی ہے - ادبی تاریخ کے اندر کام کر کے ناصر کاظمی نے ہمارے تہذیبی اور فکری اداروں کی تصدیق فراہم کی ہے -

اسی ضمن میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ناصر کاظمی کی غزل میں غزل کی معروف مشینری دکھائی نہیں دیتی - اور غزل کی لسانیات

کے بارے میں بھی انحراف نظر آتا ہے ۔ مثلاً عشق کی مرضیاتی صورت اور اذیت ناکی کی نفسیات دونوں اجزا ناصر کاظمی کی غزل میں شامل نہیں ہیں ۔ اس کے علاوہ غزل کے عشقیہ کردار جو کبھی لیلٰی مجنوں یا شیریں فرہاد کی شکل اختیار کرتے ہیں اور کبھی منصور اور انا الحق کا رابطہ پیش کرتے ہیں وہ ناصر کاظمی کی غزل کے پردے پر ظاہر نہیں ہوتے ۔ گہرا سیاہ رنگ ناصر کاظمی کی غزل میں دکھائی نہیں دیتا ۔ شاید اسی لیے جہاں کہیں رات بھی نظر آتی ہے اس کا بوجھ دلوں کے لیے وحشت پیدا نہیں کرتا ۔ ناصر کاظمی اداسی کا ذکر کرتا ہے مگر یہ اداسی دل کو پژمردہ نہیں کرتی ۔ موت کا تذکرہ کرتا ہے مگر موت یادداشت بن کر زندگی میں بدل جاتی ہے ۔ اس کی غزل میں دیوانگی کا ذکر بھی ہے مگر یہ دیوانگی کوسٹمنٹ بن جاتی ہے اور اس تھیٹریکل رویے سے مختلف ہے جو پرانی غزل میں دکھائی دیتا ہے ۔ اس بدلے ہوئے منظر و پس منظر کی وجہ شاید یہ ہے کہ پرانی غزل میں انسان اپنے آپ کو انسان پر ہوتے ہوئے دکھ کی درجہ بندی کے حوالے سے ناپتا تھا ۔ اور دکھ اور اذیت کو باطنی سلوک کی رہ گزر قرار دیتا تھا ۔ ناصر کاظمی کی غزل میں انسان اپنے وجود کو خارجی مظہرات کے حوالے سے ناپتا ہے ۔ موسموں کے حوالے سے اپنے آپ کو وجود بخشتا ہے ۔ اس لیے ناصر کاظمی کی غزل کا آدمی دکھ کی بجائے شوق اور اذیت کی جگہ استقلال کو چنتا ہے ۔

(۳)

اگر ناصر کاظمی کی غزل کی زبان کو دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ زبان تغزل کی زبان نہیں ہے ۔ یہ زبان روزمرہ گفتگو کی زبان ہے اور ایسے ذہنی رویّوں کی زبان ہے جن سے ہم عصر نسلیں گزر رہی ہیں ۔ ناصر کاظمی کی کامیابی یہ ہے کہ اس نے ہماری روزمرہ گفتگو کو غزل میں بدل دیا ہے ۔ یہ کام اتنا آسان شاید نہیں تھا کیونکہ روزمرہ گفتگو کو غزل میں بدلنے کے لیے شدید تخلیقی اور جذباتی طبیعت کا ہونا لازمی ہے ۔ ناصر کاظمی کی تخلیقی و ذہنی قوت نے زبان کو شاعری میں بدل کر شاعری کے بنیادی فکر کو ایک ایسے زمانے میں قائم کیا ہے جو شاعری کو محض لفظوں

کی کمپوزیشن سمجھتا ہے ۔ ناصر کاظمی نے روزمرہ زبان کو غزل میں بدل کر ایک مزاج کی تشکیل کی ہے اور ایک نیا راستہ دیا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ غزل کی روایت میں لفظ ، جذبے اور شعر کی ایک نئی تکنیک ایجاد کی ہے ۔ نئی غزل کے کھلتے ہوئے راستے پر ناصر کاظمی کی خوشبو دور دور تک پھیلتی رہے گی !

(۴)

ناصر کاظمی کا شعری رویہ اس تہذیبی رجحان کا دیا ہوا رویہ ہے کہ جس سے ہماری تہذیب کے صوفیاء ، علماء اور اہلِ نظر پیدا ہوتے رہے ہیں ۔ یہ رویہ فرد کی اکائی کا رویہ ہے ۔ فرد کی ایسی اکائی اپنے تجربے سے جس سچائی کو برآمد کرتی ہے وہ انسان اور کائنات کے درمیان نیا اور پائے دار رشتہ قائم کرتی ہے ۔ میں نے کچھ دیر پہلے کائنات کے ساتھ گفتگو کے رشتے کا ذکر کیا تھا ۔ تاہم یہ رویہ جس کی طرف میں اب اشارہ کر رہا ہوں اس مقام سے آگے بڑھنے کا ضامن ہے ۔ ملّا شیرازی المعروف ملّا صدرا ، فرد کی اکائی کو اہم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فرد اپنے تجربے کے ذریعے نہ صرف معروضی دنیا کی صورت اختیار کر لیتا ہے بلکہ کائناتی وجود کے ساتھ بھی ہم شکل ہونے کی سعیٔ کرتا ہے ۔ تجربے اور فرد کے اس نظام کو ملّا صدرا ''حکمت'' کا نام دیتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری منزل بہ منزل حکمتِ اشراقیہ کی صورت اختیار کرتی ہے ۔ اور ناصر کاظمی کے شعری سفر میں ہمیں بیک وقت لفظ اور چمک کے رابطے دکھائی دیتے ہیں ۔ ناصر کاظمی لفظ کے ذریعے ساتواں در کھولتا ہے اور چمک کے ذریعے ہر شے غیر مرئی صورت اختیار کرتی ہے ۔ ناصر کاظمی کی شاعری کا یہ پہلو تفصیلی جائزے کا مستحق ہے اور نظریۂ علم کی جانب ایک راہ تیار کرتا ہے ۔ یہاں میں اس جانب صرف ایک سرسری اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کروں گا ۔ ناصر کاظمی کی غزل میں ، بعض دوستوں نے ویران بستیوں ، اداس گلیوں ، کھلی کھڑکیوں اور بے آباد راستوں کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے اور دھوپ کی شدت کے تاثر کو بھی ملحوظ ٹھہرایا ہے ۔ ایسے منظر کو معروض میں محروسی کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے اور ایسا

کرکے اُس بڑے نظامِ فکر کو نظرانداز کیا گیا ہے جو میرے خیال میں شاعر کے دیے ہوئے نظریۂ علم کو قائم کرتا ہے اور جسے میں نے حکمتِ اشراقیہ کہا ہے ۔ اس ضمن میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ''لوگ'' ناصر کاظمی کا موضوع نہیں ہیں اور نہ آبادیوں ہی سے اُس کے تخلیقی ذہن کو کوئی دل چسپی ہے ۔ فرد اور وجودِ کل کا رشتہ ہی ناصر کاظمی کے نظریۂ علم کا بنیادی عقیدہ ہے ۔

میں نے پچھلے برس ناصر کاظمی کی برسی پر اس منظر کو ، جس کا میں نے ذکر کیا ہے ، شامِ غریباں کا منظر نامہ قرار دیا تھا ۔ ناصر کاظمی ایسے منظر نامے میں جہاں بے آباد محلّے اور آداس بام و در ہیں سورج کو برہنہ پا ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک ایسے مکان کے باہر سورج بھی ننگے پاؤں کھڑا ہے ۔ یہ منظر آداسی یا محروسی کا منظر نہیں ہے بلکہ اُس مکمل جائزے کا ایک نیا پہلو ہے جو کائناتی رشتے میں کبھی پرندوں ، کبھی پانیوں اور کبھی پھولوں اور کبھی ضمیر مخاطب یعنی 'تو ، کی شکل میں دکھائی دیتا ہے ۔ میں اس منظر کے معانی پر زیادہ کہنا نہیں چاہتا البتہ یہ ضرور پوچھوں گا کہ وہ کون سا مکان ہے جس کے دروازے پر سورج بھی عقیدت کے ساتھ پا برہنہ کھڑا ہوتا ہے ، اور یہ آداس در و بام کن کے ہیں ، اور اُن کے ساتھ کیا پیش آیا ہے ، اور وہ کون سی راہ پر جا چکے ہیں ، اور روشنی اتنی بے دریغ کیوں ہے کہ اپنی جلن کی بجائے اپنے عجز کا اظہار کرتی ہے ؟ ناصر کاظمی نے روشنی (جس کا مظہر سورج ہے) اور بے آباد در و بام (جس کا مظہر مکان اور گلیاں ہیں) کے باہمی رشتے سے ''گئے دنوں کا سراغ'' فراہم کیا ۔ اور جس صداقت کو ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ روشنی ، اپنی چمک کے باوجود عجز بن چکی ہے ۔ کیوں اور کس لیے ؟ یہ سوال ، جواب سے کہیں زیادہ اہم ہے !

(۵)

شاعری بنیادی طور پر نظریۂ علم ہے اور کیونکہ شاعری کا راستہ ارتفاعی ہے اور ارتفاع کی تلاش میں علم کے اجزاء میسر آتے ہیں اس

واسطے میں نے اس جانب آپ کی توجہ مبذول کروانے کی خاطر اتنا وقت لیا ہے۔ ناصر کاظمی ایک زندہ شاعر ہے۔ اور اُس کی زندگی اُن اقدار کے ساتھ موسوم ہے جن سے ہم، ہماری تہذیب اور ہماری آیندہ نسلیں وابستہ ہیں —— تاہم میں نے ناصر کاظمی کے مقام کو اُس کے تہذیبی اور الٰہیاتی حوالے سے پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ اس کے ساتھ کہاں تک اتفاق کریں گے مگر ناصر کاظمی نے، اپنی غزل کے ذریعے، اپنے زمانے اور اپنی ہم عصر نسلوں کے لیے شعری الٰہیات کا جو منظر مرتّب کیا ہے وہ ہمارے شعری ادب میں ایک بے حد قیمتی باب کا اضافہ ضرور کرتا ہے!

* * *

ناصر کاظمی "برگِ نے" کے بعد

شمس الرحمٰن فاروقی

ناصر کاظمی کے نقّاد کی حیثیت سے مجھے دو بڑی مشکلوں کا سامنا ہے۔ اور یہ مشکلیں اس مسئلے کے علاوہ ہیں کہ مجھے ان کے بارے میں اپنی ایک قدیمی رائے کی تردید بھی کرنی ہے۔ بہت دن ہوئے میں نے لکھا تھا کہ "برگِ نے" کی اشاعت کے بعد ناصر کاظمی کا ارتقاء رک سا گیا ہے۔ مراد یہ تھی کہ وہ شاید "برگِ نے" کے ذریعے مقبوضہ علاقے پر ہی قناعت کر چکے ہیں اور اب ان سے کسی نئی تسخیر کی اُمید نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی برس کے جمود کے بعد ناصر کاظمی کی شاعری نے نہ صرف ارتقاء کے نئے منازل طے کیے بلکہ ان کے شعری مزاج میں بھی ایسی تبدیلیاں آئیں جو اقداری اور مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ "برگِ نے" کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد جدید شاعری میں تجربہ اور انحراف کی ہوا کچھ اس شدت سے بہنے لگی کہ ناصر کاظمی (جو اس وقت تک خاصے عزت دار ہو چکے تھے) نئے شعرا کی آزادہ روی سے ناخوشی اور ان کے شعری نظریات سے برأت کا اظہار کرنے اور اس طرح خود کو ٹھوس، کلاسیکی روایت کا ایک جز ثابت کرنے میں حق بجانب سمجھنے لگے تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار کا لہجہ صاف بتاتا ہے کہ وہ شعریات میں عصری تاخت و تاراج سے دور ہی نہیں، بلکہ اس کے مخالف بھی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ناصر کاظمی نہ ہوتے تو جدید غزل کو ظہور میں آنے کے لیے ان کا منتظر رہنا پڑتا، لیکن بیش تر کام یاب شعرا کی طرح وہ بھی خود کو اس منظر سے الگ رکھنے کے لیے کوشاں تھے جس کا پس منظر ان کی ہی شاعری تھی:

زباں سخن کو سخن بانک پن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسے گا

نئے پیالے سہی تیرے دور میں ساقی
یہ دور میری شرابِ کہن کو ترسے گا

یہ خاص و عام کی بے کار گفتگو کب تک
قبول کیجیے جو فیصلہ عوام کریں

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

یہ اشعار ان شعروں کے علاوہ ہیں جن میں پرانی چیزوں کے گزرنے کا ماتم کیا گیا ہے اور شاید ان کی تہہ میں گزرتے وقت کی سرد مہری کے علاوہ نئے اسالیبِ سخن کی یلغار اور پرانے اسالیب کی نسبتاً کم قدری کا احساس بھی کارفرما ہے ۔ بنیادی بات یہ ہے کہ تجربے کی بھیڑ بھاڑ میں ناصر کاظمی کی شاعری (جس کا تعلق پرانی شاعری سے بہ ظاہر بہت مضبوط تھا) خود کو تنہا اور پس ماندہ محسوس کرنے لگی تھی اور اس احساسِ پس ماندگی سے آزاد ہوتے ہوتے ناصر کاظمی کو کچھ عرصہ لگ گیا ۔ میری بات صرف اسی حد تک صحیح تھی ۔ کیونکہ جمود کے حمامِ بادگرد سے نکلنے کے بعد ناصر کاظمی ”برگِ نے“ کے نیم رومانی ، نیم حزینہ شاعر نہ رہے ۔ مزاج کی انفعالیت اور چھوٹی سی ذات کے چھوٹے موٹے المیے میں گم رہنے کا رجحان ، جو ”برگِ نے“ کی امتیازی خصوصیات میں سے ہیں ، اب بھی باقی تھے ، لیکن یہ عناصر اب شریک تھے غالب نہیں تھے ۔ شعری کردار کے بلوغ کے ساتھ ساتھ بعض نئی کمزوریاں ، مثلاً معلمانہ طرز گفتگو ، مربیانہ انداز بیان اور نام نہاد ”فکری“ شاعری کی جھلک بھی آتی ہے ۔ لیکن نئی کمزوریاں اور پرانی کمزوریاں دونوں نئی مضبوطیوں کے آگے سپرانداز ہونے لگیں ۔ اسی لیے میں ”دیوان“ اور ”دیوان“ کے بعد والے ناصر کاظمی کو ”برگِ نے“ کے ناصر کاظمی سے بہتر ہی نہیں بلکہ مختلف شاعر بھی سمجھتا ہوں ۔ اور اس حد تک میری پچھلی رائے کہ ناصر کاظمی کا ارتقاء رک گیا ہے ، غلط تھی ۔

لیکن میں نے ابھی تک ان دو اہم مشکلوں کا ذکر نہیں کیا ہے

جن کا سامنا مجھے ناصر کاظمی کے نقّاد کی حیثیت سے کرنا پڑ رہا ہے۔ پہلی مشکل تو دوسرے نقّادوں اور مبصروں کی پیدا کردہ ہے اور دوسری مشکل خود میری مرہونِ منت ہے۔ نقّادوں اور مبصروں کی پیدا کردہ مشکل یہ ہے کہ ہر مشہور اور با اثر شاعر کی طرح ناصر کاظمی کے بارے میں بھی بعض ایسی باتیں مروج ہو گئی ہیں جن کی گواہی ان کے کلام سے نہیں ملتی۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ناصر کاظمی میر کے اسلوب کا اتباع کرتے ہیں اور چونکہ فراق بھی میر کے ہی اسلوب کے سپرد ہیں، اس لیے ناصر کاظمی اور فراق کا بھی رشتہ بہت قریبی اور مستحکم ہے۔ میر سے استفادہ کرنا اور چیز ہے اور میر کا اتباع (یعنی ان کے رنگ میں غزل کہنا) اور چیز۔ یہ بات تو تسلیم کی جا سکتی ہے کہ ناصر کاظمی نے میر سے استفادہ کیا ہے (فراق کے بارے میں تو اتنا بھی نہیں کہا جا سکتا) لیکن انھوں نے میر کے رنگ میں غزل کہی ہے، اسے وہی تسلیم کر سکتا ہے جس نے میر یا ناصر کاظمی یا دونوں ہی کا کلام نہ پڑھا ہو۔ غالب کی ذہنی بلند کوشی اور تعقل پرستانہ پیچیدہ خیالی جو روایتی جذبات انگیز شاعری سے مختلف ردِ عمل پیدا کرتی ہے، سودا کی لفظی ٹھونک ٹھانک، ناسخ کی بے روح مگر بال کی کھال نکالنے والی ''نازک خیالی''، مومن کی سطحی پیچیدگی، یگانہ کی زور دار مگر شعری تخیلات سے بیگانہ اکڑفوں، ان سب کے مقابلے میں میر کی عاشقانہ شاعری کو اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے تو وہ یقیناً نرمی، تڑپ، چبھن، ارتعاش، گھلاوٹ، خستگی، برشتگی وغیرہ قسم کی مہمل اور غیر تنقیدی اچھائیوں سے مملو نظر آئے گی۔ اور چونکہ ناصر کاظمی کا کلام (چاہے وہ ''برگِ نے'' کے دور کا میٹھا میٹھا، رومانی طرز کا ہو یا بعد کے حلاوت آمیز اسلوب کا) سودا، مومن، ناسخ، غالب، یگانہ وغیرہ کے کلام سے مماثلت نہیں رکھتا اس واسطے اس کا میر کے انداز میں ہونا لازمی ہے! اس قسم کی تنقیدی ٹامک ٹوئیوں نے ناصر کاظمی کو نقصان زیادہ پہنچایا، فائدہ کم۔ وہ خود میر کو پسند کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ میر کے متبع یا نقّال بھی کہے جاتے، لیکن ان کی میر پسندی اس درجہ مشہور کر دی گئی کہ انھیں بھی یقین آ گیا کہ وہ پیروِ میر ہی نہیں بلکہ حامیِ طرزِ میر بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بالغ ہونے میں دیر لگی، بلکہ وہ آخیر عمر تک بھی پوری طرح بالغ نہ ہو پائے۔

ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی کا اسلوب ایک انتہائی اچھوتا اسلوب تھا۔ اگر اس پر میر کا پرتو ہے تو غالب کا بھی انعکاس ہے۔ میر اور غالب اور ان کے واسطے سے فانی کی جھلک ان کے کلام میں نظر آتی ہے، لیکن یہ محض جھلک ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ مجموعی طور پر اپنے بہترین لمحات میں ناصر کاظمی ہماری غزل کے گنے چنے مولک (Original) شاعروں میں سے ایک ہیں۔ میر اور فراق کے تازیانے ان کی شاعری پر اس بے دردی سے لگائے گئے کہ ان کا اپنا رنگ پہچان ہی میں نہ آ سکا۔ یہ درست ہے کہ اگر ان کو اردو غزل کے قطبین یعنی میر اور غالب کے سامنے رکھیے تو چونکہ وہ غالب سے بہت دور نظر آتے ہیں اس لیے لامحالہ ہماری آسان پرست تنقید نے انھیں میر کے نزدیک سمجھ لینے میں عافیت سمجھی۔ اور چونکہ سطحی مطالعہ کرنے والوں کو میر صاحب عشقیہ جذبات انگیزی کے بادشاہ نظر آئے اور ناصر کاظمی بھی عشقیہ شاعر ہیں اس لیے ان کے یہاں اسی قسم کی جذبات انگیزی ڈھونڈ لینا مشکل نہ تھا جیسی کہ میر کے کلام میں نظر آتی ہے۔

اب رہے فراق، تو یہ مفروضہ ہی بالکل غلط ہے کہ وہ میر کی طرز کے شاعر ہیں۔ آؤ ہو، جاؤ ہو اور ہندی بحروں کا استعمال اگر میر کا رنگ پیدا کر سکتا ہے تو ہمارے عہد کے اور بھی چھوٹے موٹے مشاعر اس شرف سے مشرف ہو جاتے ہیں۔ فراق کے یہاں میر کی سی بصیرت (Wisdom) ہے نہ وسعتِ نگاہ، نہ میرت، نہ تجربے کی رنگا رنگی اور وہ مرکزی علامت سازی تو فراق کی دسترس سے کوسوں دور ہے جو میر کا حقیقی طرۂ امتیاز ہے۔ فراق کو زبان پر اتنا اختیار بھی نہیں ہے جتنا ناصر کاظمی کو تھا، میر کی سی حاکمانہ شان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ان تمام باتوں کی مختصر تفصیل آگے مرتب کروں گا، اس وقت تو صرف اس غلط فہمی کے ازالے کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ میر، فراق اور ناصر کاظمی ایک رنگ کے شاعر ہیں۔ فراق دراصل ہمارے دور کے مصحفی ہیں۔ ان کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے۔ وہ اصلاً مومن اور حسرت کی طرح کے سطحی اور بظاہر عشقیہ لیکن بباطن رسمی شاعر ہیں۔ مومن اور حسرت نے تو اپنا رنگ قائم بھی کر لیا لیکن فراق کی ایک ہی دور کی غزلیں اتنے بہت سے اسالیب کی حامل ہیں کہ ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ فراق نے اردو غزل کو ایک

نیا لہجہ دیا - ان کا اور میر کا رشتہ اتنا ہی فرضی ہے جتنا میر اور آسی غازی پوری کا (جن کے بارے میں مجنوں گورکھ پوری نے کہا تھا کہ عصری غزل میں میر کے رنگ کا صحیح ترین اتباع انھیں کے کلام میں ملتا ہے[1] -) ناصر کاظمی ، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے ، ان گنتی کے غزل گو شعرا میں ہیں جن کا اسلوب سولک ہے - ''برگِ نے'' کی کچھ غزلیں فراق کی زمینوں میں ضرور ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ ان پر فراق کا پرتو ہے ، یہ اس لیے کہ خود فراق کا کوئی رنگ ہی نہیں ہے جس کا اثر دوسروں پر پڑے - یہ اور بات ہے کہ ناصر کاظمی نے فراق کے توسط سے کچھ دوسرے کلاسیکی شعرا کو پہچانا - دوسری مشکل جو میری اپنی پیدا کردہ ہے ، اس کا حل اتنا آسان نہیں ہے - ناصر کاظمی کے کلام میں دماغ کی کارفرمائی مجھے بہت کم نظر آتی ہے - وہ میر کی طرح ُپراسرار اور شاہانہ استغنا کے بھی حامل نہیں ہیں کہ جو جس طرح کہہ دیا وہی ٹھیک سمجھا جائے - وہ مجموعی طور پر یک سطح دماغ کے شاعر ہیں - میر کے یہاں عالی دماغی ہے لیکن اس سے بھی آگے ایک پیچیدہ دماغی ہے جو ُپراسرار شعر خلق کرتی ہے - غالب میر سے زیادہ عالی دماغ ہیں اور ُپراسرار بھی - اگر اردو غزل کے قطبین میں یہ خواص مشترک ہیں اور اگر ناصر کاظمی میں یہ خواص بالکل نہیں یا بہت کم ہیں تو وہ اچھے شاعر کیوں کر ہوئے ؟ اس سوال کے کئی حل ممکن ہیں اور شاید سب کے سب صحیح ہی ہیں - سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ناصر کاظمی اپنے اسلوب کی تازگی کے باوجود بہرحال غالب اور میر کے درجے کے شاعر ہرگز نہیں ہیں - دوسری بات یہ ہے کہ یک سطح دماغ شاعری کے لیے اتنا نقصان دہ نہیں جتنا سفیہہ یا سخیف دماغ ہوتا ہے - سفاہت اور سخافت کا شاعری سے کوئی رشتہ نہیں - جارج ہربرٹ یقیناً ڈن کے مقابلے میں چھوٹے دماغ کا شاعر ہے لیکن اس کے اچھے اور اصلی شاعر ہونے میں کوئی شبہہ نہیں - بلکہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عالی دماغ ہو (جیسے ناسخ اور یگانہ) لیکن تخیلی فکر نہ رکھنے کی وجہ سے اچھا شاعر نہ بن سکے - اچھا شاعر بننے کی اولین شرط یہ ہے کہ محصل تجربہ

۱- آسی غازی پوری کے عمدہ شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن وہ طرزِ میر کے شاعر نہیں ہیں -

(علم ، احساس ، وجدان) اور اجتماعی لاشعور وغیرہ کے سب عناصر کو تخیلی فکر کی روشنی سے منور کیا جا سکے - اس کی ایک نہایت سادہ مثال دیکھیے - یہ سب شعر ہجر کی کیفیت کے تقریباً ایک ہی پہلو کا ذکر کرتے ہیں :

مصحفی : شب ہجر صحرائے ظلمات نکلی
میں جب آنکھ کھولی بہت رات نکلی

حسرت : مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

ذوق : کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر
کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے

فراق : اب دور آسماں ہے نہ دور حیات ہے
اے درد ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

چاروں شعر ہجر کی طوالت کا اظہار کرنے کے لیے معروضی وقت کو موضوعی وقت میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں - ذوق اور حسرت کی کوشش زمین سے اوپر نہیں آٹھ پاتی کیونکہ گھڑیوں کی طوالت کا پیمانہ مہینوں کی طوالت کے ذریعے ظاہر کر دیا گیا ہے - موضوعی وقت بھی اگر معروضی پیمانے میں مقید کر دیا جائے تو وہ محض مبالغہ ہو کر رہ جاتا ہے جو استعارے کی پست شکل ہے - جدائی کی گھڑی چاہے ایک مہینے میں گزرے چاہے سو مہینوں میں ، لیکن جب مختتم ٹھہری تو اس کی وقعت بہرحال زمان میں قید رہ جائے گی - استعارے کے باب میں مڈلٹن مری نے کیا خوب بات کہی ہے کہ اس کی چھان بین کی آخری حدیں جنون سے ملتی ہیں - یہ اس لیے کہ جنون کسی قاعدے یا نظم کا پابند نہیں ہوتا اور استعارہ اپنی انتہائی شکل میں لامتناہی ہو جاتا ہے - بودلیئر جب جنون کے غار کے دہانے پر لڑکھڑا رہا ہوتا ہے تو اس کیفیت کا اظہار کرنے کے لیے یہ غیر فانی مصرع کہتا ہے :

میری کھڑکیوں کے باہر کچھ نہیں ہے ، صرف لامتناہیت ہے

یہاں معروضی وقت موضوعی وقت میں خم ہی نہیں ہو جاتا بلکہ زمان اور

مکان ہی ایک ہو جاتے ہیں ۔ زبان و بیان کی لڑکھڑاہٹ سے قطع نظر (جب دورِ آسماں ہی نہ رہ گیا تو دورِ حیات کہاں سے ہوگا ؟ دو میں سے ایک فقرہ غیر ضروری ہے ۔ دردِ ہجر تو ہی بتا میں "ہی" کی تاکید سے شبہہ ہوتا ہے کہ اگر دورِ آسماں یا دورِ حیات ہوتے تو وہ بتا دیتے کہ رات کتنی باقی ہے ۔) فراق نے بھی معروضی وقت کو لامتناہی کرنے کی کوشش میں کامیابی حاصل نہیں کی ، وہ صرف قربِ قیامت کا منظر پیش کرکے رہ گئے ہیں ۔ دورِ آسماں ختم ہوگیا ، دورِ حیات بھی ختم ہوگیا ، یعنی زمانی وقت (Temporal time) کی موت ہو گئی ، مگر مطلق وقت (Absolute time) تو پھر بھی باقی رہا ، اس لیے فراق کا شعر حسرت اور ذوق کی کوششوں کی محض انتہائی منزل ہے اور لامتناہی وقت کو ظاہر کرنے میں ناکام رہتا ہے ۔ دورِ آسماں اور دورِ حیات ختم ہوگئے ہیں لیکن پھر بھی کچھ باقی ہے جس کے حوالے سے ہجر کی رات کو ناپنا ممکن ہے ۔ مصحفی نے شبِ ہجر کو صحرائے ظلمات کہہ کر بودلیئر کی طرح زمان اور مکان کو ایک کر دیا ہے اور جب آنکھ کھولی بہت رات نکلی کا استعارہ خلق کرکے شبِ ہجر کو ایک ایسا continuum بنا دیا ہے جس کی ابتدا یا انتہا کچھ نہیں ۔ پہلی بار آنکھ کھولنے پر بھی بہت رات تھی اور آخری بار آنکھ کھولنے پر بھی بہت رات تھی ۔ معروض پوری طرح موضوع میں تبدیل ہوگیا ہے ۔ یہی تخیلی فکر کا کمال ہے ۔ ہجر کی رات کاٹے نہیں کٹتی ، یہ ایک محصل تجربہ ہے جو تمام شاعروں میں مشترک ہے ۔ اب اس کو جس طرح بیان کیا جائے ، بنیادی حقیقت وہی رہتی ہے لیکن تخیلی فکر اس کو ہر بار نیا رنگ دیتا ہے ۔ یہ فکر اگر ناکام ہو تو حسرت یا ذوق کی طرح کا شعر وجود میں آتا ہے اور اگر محض ایک حد تک کامیاب تو فراق کا شعر ہوتا ہے ۔

بہرحال بات ہو رہی تھی ناصر کاظمی کے دماغ کی ۔ ان کے دماغ کی یک سطحیت یہ ہے کہ وہ اپنے غم کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان کا اپنا غم معلوم ہوتا ہے ۔ یہی ان کی مضبوطی بھی ہے اور میرے اس سوال کا جواب بھی کہ جب یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ناصر کاظمی کی دماغی پرواز بہت بلند نہیں ہے تو وہ عمدہ شاعر کیوں ہیں ؟ ناصر کاظمی اور بودلیئر میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں کرب کی انتہائی منزلوں کے

ذائقہ شناس ہیں ، لیکن ان کے کرب میں نہ وہ نام نہاد آفاقیت ہے اور نہ وہ غمِ جاناں برابر غمِ دوراں والا فارمولا جنھیں اردو کے نقّاد انتہائی فرض شناسی کے ساتھ مختلف شعرا میں تلاش کرتے رہے ہیں - دونوں اپنے درد کا اظہار محض اپنے حوالے سے کرتے ہیں ، دونوں اس بات کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں کہ وہ ''میں'' جو ان کے اشعار میں بول رہا ہے بودلیئر ہی ہے ، ناصر کاظمی ہی ہے ، کوئی فرضی یا اجتماعی انسان نہیں ہے - ناصر کاظمی جو کچھ کہتے ہیں اور جو کچھ سہتے ہیں وہ سب اپنی طرف سے اور اپنے اوپر کہتے سہتے ہیں - فرق یہ ہے کہ بودلیئر کا کرب روحانی اور اس کی تلاش مابعدالطبعیاتی ہونے کی وجہ سے چھوٹے موٹے معاملات سے بہت ماورا ہے - اس کا تخیل بھی ناصر کاظمی کے بہ نسبت بے حد بے لگام ، جرأت مند اور علامت آمیز ہے - اسی لیے بودلیئر بہ یک وقت غالب ، میر ، جان ڈن اور مولانا روم کا امتزاج معلوم ہوتا ہے - ناصر کاظمی ذاتی غم کے ذاتی رنگ میں اظہار کی حد تک بودلیئر کے ہم نوا ہیں - ناصر کاظمی کا کٹر سے کٹر ترقی پسند دوست بھی ان کے کلام میں "روحِ عصر" نہیں تلاش کر سکتا - اجتماعی سماجی زندگی کے خفیف ترین پرتو کو ڈھونڈنے کے لیے ''برگِ نے'' اور ''دیوان'' (اور بعد کی غزلوں) کو بڑے غور و تفحّص سے پڑھنا پڑتا ہے - لیکن یہ شیش محل یا مینارِ عاج والی محفوظ شاعری بھی نہیں ہے - بس یہ ہے کہ ناصر کاظمی نے اپنے عشق اور اس عشق کے لائے ہوئے درد کی دولت کے علاوہ ہر چیز پر آنکھ بند کر لی تھی - وہ فراق اور فیض وغیرہ سے بہت مختلف آدمی ہیں - اس کی دلیل ان کا عشقیہ رویہ ہے جو زمانے کے اور غموں کو گھاس نہیں ڈالتا - نکتہ یہ ہے کہ عشقیہ شاعری ہونے کے باوجود ان کی شاعری متروک (Archaic) نہیں ہے کیونکہ انھوں نے طرح طرح سے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ صرف اپنی طرف سے بول رہے ہیں :

فرصت ہے اور شام بھی گہری ہے کس قدر
اس وقت کچھ کلام نہیں آپ سے مجھے

دل ہے مرا لہو لہو تاب نہ لا سکے گا تُو
اے مرے تازہ ہم نشیں تُو مرا ہم سبو نہ بن

تجھے تو گھیرے ہی رہتے ہیں رنگ رنگ کے لوگ
ترے حضور مرا حرفِ سادہ کیا کرتا

کیا کہوں اب تجھ سے اے جوئے کم آب
میں بھی دریا تھا اُتر کر رہ گیا

اس طرح کے بیسیوں اشعار ہیں جن میں یکتائی کی صورتِ حال صاف نظر آتی ہے - اسے جدید ادب کے روایتی alienation سے تعبیر نہیں کر سکتے - کیونکہ ان اشعار میں جو شخص جلوہ گر ہے اسے دوسروں کے وجود کی ضرورت نہیں ہے، وہ اپنے وجود کے اظہار (یا اپنے وجود کے پارہ پارہ ہونے کے اظہار) میں اس قدر منہمک ہے کہ اسے فرصت ہی نہیں کہ وہ alienation کا احساس کر سکے - یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ alienation آپ سے آپ نہیں پیدا ہوتا، اس کے لیے وجودِ غیر انا کے شدید تجربے کی ضرورت ہوتی ہے - alienation کا مفہوم تنہائی نہیں، بلکہ پہچاننے کی مشکل ہے، یعنی وہ کیفیت جب جانی پہچانی صورتیں، اشیاء اور صورتِ حالات نا مانوس اور اجنبی محسوس ہوتی ہیں - یا پھر نئے محسوسات انسان پر اس طرح طاری ہوتے ہیں گویا یہ کیفیات پہلے بھی گزر چکی ہیں - ظاہر ہے کہ ناصر کاظمی کے یہاں غیر انا کا وجود ہی نہیں، لہٰذا alienation ان کے یہاں مفقود ہے - یہاں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ جب تمام ہی شاعر اپنی بیتی سناتے ہیں اور اپنے غم کا اظہار کرتے ہیں تو پھر ناصر کاظمی کی کیا خصوصیت ہے؟ لیکن یہ سوال غلط فہمی پر مبنی ہے - کیونکہ اول تو یہ کہ تمام شاعر نہیں، بلکہ صرف اچھے شاعر اپنی بیتی سنانے اور اپنے غم کا اظہار کرنے پر وہ قدرت رکھتے ہیں کہ ان کی بات جھوٹی، فرضی اور مصنوعی نہ معلوم ہو - اپنا دکھڑا سنانے والے کا مقدر جمائیاں ہوتی ہیں - ذاتی درد کا اظہار کرنے والی شاعری اگر اعلیٰ درجے کی نہ ہو تو وہ بھی آپ کو اتنا غیر متأثر چھوڑ جائے گی جتنا کسی بھی اجنبی کے confidences کہ جن کو سن کر آپ بور ہوتے ہیں - ذاتی درد کا اظہار اچھی شاعری میں آسان نہیں ہے - لیکن ناصر کاظمی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذاتی کرب کا اظہار اس سطح پر کرتے ہیں جہاں اس میں حصّہ

نہیں لگایا جا سکتا ، نہ اسے پھیلا کر دوسروں پر منطبق کیا جا سکتا ہے - آپ اس سے متاثر تو ہوتے ہیں ، لیکن اس احساس کے ساتھ کہ آپ کو صرف متأثر ہونے کا حق ہے ، شریک ہونے کی اجازت نہیں - یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی ایسے اشعار میں بھی جان سلامت نکال لے جاتے ہیں جنھیں دوسرے کہیں تو رومانی پلپلے پن اور شوں شاں کرنے والے آنسوؤں کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے :

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے

بلاؤں گا نہ ملوں گا نہ خط لکھوں گا تجھے
تیری خوشی کے لیے خود کو یہ سزا دوں گا

ہچکی تھمتی ہی نہیں ناصر
آج کسی نے یاد کیا ہے

میں تو آج بہت رویا ہوں
تو بھی شاید رویا ہوگا

آج تو میرا دل کہتا ہے
تو اس وقت اکیلا ہوگا

میرے چومے ہوئے ہاتھوں سے
اوروں کو خط لکھتا ہوگا

یہ ناصر کاظمی کے بہترین شعر نہیں ہیں ، لیکن یہ شعر ایسے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کسی سے بھی ایسے بن نہیں سکتے تھے - ان کو پڑھ کر ہنسی نہیں آتی ، جب کہ عام طور پر اس طرح کی شاعری پڑھ کر شاعر کی عقل پر رونا اور اپنے اوپر ہنسی آتی ہے - ندا فاضلی نے کہیں کہیں اس طرح کے عشقیہ آہنگ کو بہت احتیاط سے بلکہ اور زیادہ دھیما کرکے برتتا ہے لیکن

ان کے یہاں خود شاعر اتنا صاف نظر نہیں آتا جتنا ناصر کاظمی کے شعروں میں ہے - اس لیے دوسروں کے مقابلے میں اس آہنگ کو نسبتاً کامیابی سے برت پائے ہیں - ورنہ کم تر درجے کے شاعر اس لہجے میں گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو حسبِ ذیل[1] قسم کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے :

تیرا ملنا بہت ضروری تھا
ورنہ میرا وجود کھو جاتا

دل تھام لو گے جب بھی مرا نام لو گے تم
اک آہ بن کر آؤں گا لب پر جب آؤں گا

یہ ہو کر بے زباں کرتی ہے باتیں
تری تصویر کا کہنا ہی کیا ہے

اس طرح ہوتی رہی تکمیلِ جذباتِ وفا
ہم ادھر روتے رہے اور وہ اُدھر روتے رہے

آخری شعر کے ساتھ ناصر کاظمی کا یہ شعر رکھیے - اگر اب بھی دلیل و تجزیہ ضروری ہو تو تنقید واقعی کارِ بے کاراں ہے :

میں تو آج بہت رویا ہوں
تو بھی شاید رویا ہوگا

لیکن پھر بھی ، اہتمامِ حجّت کے لیے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم ادھر روتے رہے —— والے شعر کا پہلا مصرع بالکل بے کار ہے ، اور تکمیلِ جذباتِ وفا کے ساتھ ادھر آدھر کے تذکرے نے باقاعدہ باجماعت اور جو نیت امام کی وہ میری والی صورت پیدا کر دی ہے - ہم اور وہ نے یگانگت کے بجائے افتراق کا احساس پیدا کیا ہے - اگر اس میں کوئی شبہہ ہو تو مصرع یوں کر دیجیے اور دیکھیے کہ مکالمے یا خود کلامی

۱- یہ اشعار مختلف شعرا کے ہیں -

کے رنگ نے یگانگت کا تاثر پیدا کیا کہ نہیں :

میں ادھر روتا رہا اور تو اُدھر روتا رہا

ظفر اقبال اس نکتے سے آشنا ہیں ، اسی لیے ان کے مطلع میں محبوب کی شخصیت دوئی کا استحکام کرنے کے بجائے اس کی نفی کرتی ہے :

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

ناصر کاظمی کے شعر میں معنی کی ایک اور تہ بھی ہے جو زیرِ بحث شعر (ہم ادھر روتے رہے ـــــ) میں مفقود ہے ۔ میں تو آج بہت رویا ہوں ، لیکن تو شاید رویا ہوگا ، اور وہ بھی یوں کہ میرے بہت رونے کے مقابلے میں تیرے کچھ ہی آنسو نکلے ہوں گے ۔ ناصر کاظمی کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ اپنے درد میں اس درجہ گم ہیں کہ محبوب کا درد بھی اس کا ایک چھوٹا سا حصّہ معلوم ہوتا ہے ۔

میں نے کہا ہے کہ یہ خیال کہ ناصر کاظمی میر کے پیرو ہیں ، ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتا ۔ یہ بات کچھ اور نقّادوں نے بھی کہی ہے ، لیکن وہ counter point کے طور پر ان کو غالب اور اقبال کے شعورِ حیات و کائنات کا خوشہ چیں ، یا کم سے کم ان کی طرح کا شعورِ حیات و کائنات رکھنے والا بتاتے ہیں ۔ میں نہیں جانتا کہ غالب میں شعورِ حیات کا وجود کیا معنی رکھتا ہے ، اگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ غالب اور اقبال کے کلام میں خارج کے مظاہر یا اجتماعی زندگی کا پرتو ملتا ہے تو بات صحیح ہے ۔ لیکن میرے خیال میں ناصر کاظمی کے یہاں تو خارج کے مظاہر اور اجتماعی زندگی شاید سب سے کم اہم مرتبہ رکھتی ہو ۔ ان کے کلام میں موسموں کا ذکر ضرور ملتا ہے ، لیکن وہ سارے موسم روح اور دل کے موسم ہیں جن کو شاعر نے وقتاً فوقتاً خارج میں کارفرما دیکھ لیا ہے ۔ انھوں نے رنگ ، پانی اور آواز کا زیادہ ذکر کیا ہے ، لیکن منیر نیازی کی طرح نہیں ۔ منیر نیازی پہلے خارج میں موسم کی تبدیلی محسوس کرتے ہیں ، پھر ان کی داخلی واردات اس کے لیے اندر ہی اندر تقابلی تلازمے خلق کرتی ہے ۔ ان کی نظم ''آغازِ زمستان میں دوبارہ'' کا مطالعہ اس نکتے کی وضاحت بہ خوبی

کر دے گا:

غروبِ سہر کا منظر گھڑی ہوئی گزرا
بس ایک پل کو نیستاں اسی طرح لرزا

گیاہِ سبز کی خوش بو اسی زمانے کی
اسی طرح کی مسرت بہار آنے کی

وہی جمالِ در و سقف و بام ہے میں ہوں
کنارِ رودِ سیہ فام شام ہے میں ہوں

سفید، سرخ، سیاہ، سنہرا، آبی، ہر طرح کے رنگ ہیں۔ روشنی کے اسپکٹرم کی طرح ہر رنگ اپنی اپنی جگہ روشن ہے۔ اور آخری مصرعے میں داخلی منظرنامے کو خارجی منظرنامے میں اس طرح مدغم کر دیتے ہیں کہ پورا پیش منظر داخلی واردات کا تلازمہ بن جاتا ہے۔ ناصر کاظمی کے موسم اور فطری مظاہر خارج میں کم سے کم وجود رکھتے ہیں۔ اگر ناصر کاظمی داخلی واردات سے مغلوب نہ ہوتے تو یہ منظر انہیں دکھائی بھی نہ دیتے۔

ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے
اب اس پیڑ کے پتے جھڑتے جاتے ہیں

پہلی بارش میں اور تو زرد پہاڑوں کا دامن
لال کھجوروں نے پہنے زرد بگولوں کے کنگن

کیسے کیسے بوٹے نکلے لال ہوئی جب ساری مٹی

اُڑتا پھرتا ہے پھلواریوں سے جدا
برگِ آوارہ جیسے پون پھول ہے

آج تو شہر کی روش روش پر
پتوں کا میلہ سا لگا ہے

مینہ جو برسا تو برگ ریزوں نے
چھیڑ دی بانسری درختوں میں
یہ ہوا تھی کہ دھیان کا جھونکا
کس نے آواز دی درختوں میں

لوگ سو رہے ہیں   رُت بدل رہی ہے

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اُگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت

میر نے موسموں کا ذکر بہت کم کیا ہے، کیونکہ ان کے زمانے میں موسم صرف دو تھے، موسمِ گل اور موسمِ خزاں۔ لیکن اگر ان کو اپنی شاعری میں موسم برتنے ہوتے تو وہ انہیں علامتی رنگ دیتے، کیونکہ خارج کا شعور انہیں بے حد تھا۔ اسی خارجی شعور کی بنا پر ان کی عشقیہ شاعری اپنے کم زور لمحوں میں بھی ایک وسیع، تجربہ کار، عاقل اور بصیرت مند ذہن کا اظہار معلوم ہوتی ہے۔ اور بہترین لمحوں میں یہ تمام عناصر اس طرح دو مصرعوں میں مرکوز ہو جاتے ہیں کہ اسرار کی سی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ میر کی عشقیہ شاعری ایک ایسے ذہن کی نشان دہی کرتی ہے جو کرب اور فرحت، اُمید اور خوف، شکست اور فریبِ آرزو کی تمام منزلوں سے گزر چکا ہے۔ ایسا ذہن جو سب کچھ دیکھ چکا ہے، جس پر سب کچھ اور جس میں سب کچھ واقع ہو چکا ہے۔ بصیرت کی یہ گہرائی اور تجربے کی یہ وسعت اس کے علاوہ کسی طرح ان کی شاعری میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اور میر کو خدائے سخن اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ عشق اور اس کے حوالے سے زمانے کے سب سرد و گرم چشیدہ ہیں۔ اردو کے کسی شاعر کے کلام میں خضر کی سی یہ تجربے کی وسعت اور اس کی پیدا کردہ knowingness نہیں ملتی۔ میر کے مقابلے میں ناصر کاظمی بالکل نا تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ عشق نے ان کو جھنجھوڑ کر اور توڑ کر رکھ تو دیا ہے لیکن اس منزل سے آگے پہنچنا، جہاں ہر چیز ہو چکی ہوئی نظر آتی ہے، ان کے بس کی بات نہیں۔ میر کے ہاں دونوں طرح کے شعر، یعنی وہ جن میں ان کا کردار ایک سرد و گرم چشیدہ،

زخم رسیدہ ، لیکن حساس ذہن رکھنے والے مردِ پیر کا کردار ہو ، اور وہ جن میں تجربے کو اپنے اندر جذب کر لینے کے باعث ارتکاز اور اس کے نتیجے میں اسرار کی فضا ملتی ہو ، کثرت سے ملتے ہیں ۔ تعجب ہوتا ہے کہ نقّادوں نے پھر بھی انھیں ایک روایتی قسم کا حرماں نصیب ، ایذا رسیدہ اور انفعالی بڈھا سمجھا اور اسی بنا پر واہ واہ کرتے رہے ۔ ورنہ یہ شعر دیکھیے :

دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے آنسو تھے سو خون ہوئے
لوہو پانی ایک کرے یہ عشقِ لالہ عذاراں ہے

عشق کے میدان داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت
یعنی مصیبت ایسی اٹھانا کارِ کار گزاراں ہے

———

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

———

چاک ہوا دل ٹکڑے جگر ہے لوہو روئے آنکھوں سے
عشق نے کیا کیا ظلم دکھائے دس دن کے اس جینے میں

———

بلا شور ہے سر میں ہم کب تلک
قیامت کا ہنگامہ برپا کریں

———

یکساں ہوئے ہیں خاک سے پامال ہوئے ہم
کیا اور اس کی راہ میں ہموار ہو کوئی

———

کرتے نہیں ہیں دل خوں اس رنگ سے کسو کا
ہم دل شدوں کی ان نے کیا خوب دل بری کی

———

مرزائی فقر میں بھی دل سے گئی نہ میرے
چہرے کے رنگ اپنے چادر کی زعفرانی

گو خاک سی اڑتی ہے مرے منہ پہ جنوں میں
ٹپکے ہے لہو دیدۂ غم ناک سے اب تک

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے
دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا
نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا

کیا کم ہے ہول ناکی صحرائے عاشقی کی
شیروں کو اس جگہ پر ہوتا قشعریرا

ان سب اشعار میں apocalypse یا مکاشفہ' موت کی کیفیت ہے۔ ہر شعر میں متکلم کا لہجہ کچھ نہ کچھ مختلف ہے۔ ناصر کاظمی لہجے کے رنگوں کی اس وسعت پر قادر نہیں ہیں، اس لیے ان کا کلام میر کے مقابلے میں محدود اور یک سُرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اتنا ہی نہیں ہے، خارج سے بے خبری میں بھی روحانی بصیرت اور داخلی اسرار کے منازل طے ہو سکتے ہیں۔ میر کا کلام اس پر دال ہے کہ وہ صرف اپنے عشق اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تجربات کے ذکر تک محدود نہیں ہیں، بلکہ مابعدالطبعیاتی فکر و مشاہدہ انھیں بیدل کی سی دنیاؤں کی بھی سیر کرا لاتا ہے:

عالم میں آب و گل کے کیوں کر نباہ ہوگا
اسباب گر پڑا ہے سارا مرا سفر میں

چشم ہو تو آئنہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

اُٹھیو سمجھ کے جا سے کہ مانندِ گرد باد
آوارگی سے تیری زمانے کو عشق ہے

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

رہتے تو تھے مکاں پہ ولے آپ میں نہ تھے
اُس بِن ہمیں ہمیشہ وطن میں سفر رہا

کل تک تو ہم وے ہنستے چلے آئے تھے یہیں
مرنا بھی میر جی کا تماشا سا ہو گیا

ان اشعار کی خوبی یہ نہیں ہے کہ ان میں کہیں کہیں صوفیانہ فکر نظر آتا ہے (بلکہ بعض شعروں میں تو اس کا محض شائبہ ہی ہے) بلکہ ان کی اصل خوبی یہ ہے کہ خارجی مظاہر سے غیر معمولی نتائج نکالے گئے ہیں۔ جان کرو رین سم اس کو اعجازیت (Miraculism) سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اعجازیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر مشابہت کے ذریعہ دو اشیاء میں ایک طرح کی وحدیت (جو نیم وحدت ہوتی ہے) ڈھونڈ لیتا ہے اور پھر اس نیم وحدت کو فوری مکمل کر ڈالتا ہے۔ خالی خولی فطرت نگار شاعر فطرت سے محبت نہیں کرتے، بلکہ اسے استعمال کرنا چاہتے ہیں، چھٹی حس کے ذریعہ اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اعجازیت نگار شعرا فطری مشابہتوں کو سچائی کا رنگ دے دیتے ہیں۔ (شاید اسی لیے بلیک نے کہا تھا کہ ہر وہ چیز جس پر ممکن کا اطلاق ہو سکے، سچائی کا پیکر ہوگی)۔ رین سم کہتا ہے کہ مابعد الطبعیاتی شاعری کی

اعجازیت تاریخ کی طرح سچی نہیں ہوتی ، لیکن یہ اشیاء کا بیان اسی طرح کرتی ہے جس طرح وہ کرنا چاہتی ہے اور اس بیان کے ذریعہ ہم پر واضح کرتی ہے کہ اشیاء ہر طور پر قابلِ غور و لحاظ ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں اسی وقت ممکن ہیں جب شاعر اشیاء کو برتنے اور تصورات کو خود سے الگ کر کے دیکھنے پر قادر ہو ۔ اس کی مختصر تفصیل کے لیے آخری شعر کو مندرجہ ذیل اشعار کے ساتھ دیکھیے :

میر : کل تک تو ہم وے ہنستے چلے آئے تھے یہیں
مرنا بھی میر جی کا تماشا سا ہو گیا

درد : ہوا سینہ داغوں سے سروِ چراغاں
کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا

مومن : کیا تم نے قتلِ جہاں اک نظر میں
کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

تینوں اشعار میں لفظ تماشا کلیدی حیثیت رکھتا ہے ۔ اور تینوں ہی میں تماشا کسی نہ کسی طرح موت سے متعلق کر دیا گیا ہے ۔ درد کے شعر میں موت واضح نہیں ہے لیکن سینے میں داغوں کا روشن ہونا عشق میں موت حاصل ہونے کی ہی منزل ہے ، کیونکہ داغوں کی کثرت نے دل کو مغلوب کر لیا ہے ۔ مومن نے ایک طرح نازک خیالی ضرور برتی ہے لیکن ان کے شعر کی اساس معشوق کے روایتی قاتلانہ کردار پر ہے ۔ اس تصویر میں کوئی اور نقش مزید نہیں ہے جو روایتی قتلِ عام کو کسی قسم کی داخلی یا روحانی اہمیت کا حامل کر دے ۔ معشوق نے ایک ہی نظر میں تمام عالم کو قتل کر ڈالا ، سب لوگ ایک ساتھ مر گئے اس لیے کوئی بھی شخص کسی دوسرے کی موت کا تماشا نہ دیکھ سکا ۔ مراد شاید یہ ہے کہ عاشقوں کو شاید مرنے کا لطف نہ آیا اگرچہ معشوق نے اپنے قتالِ عالم ہونے کا مکمل ثبوت بہم پہنچا دیا ۔ اس شعر میں موت کے لیے تماشا کا لفظ محض ایک سطحی اور سرسری مفہوم رکھتا ہے ۔ درد کی طرح طنز کا پہلو بھی نہیں ہے جو اسے کسی قسم کی ماورائیت بخش دے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موت اس شعر میں اس آخری اور حتمی اصلیت کے طور پر نظر ہی نہیں آتی جو اس کا خاصہ ہے ۔ جس طرح قتالِ عالم معشوق محض ایک convention

ہے ویسے ہی مرگِ انبوہ بھی ایک convention کے طور پر استعمال ہوتی ہے - میر کے دونوں مصرعوں کے درمیان ایک لطیف خلا ہے - یہ نہیں کہا گیا کہ کوئی شخص مر گیا ، صرف یہ کہا گیا ہے کہ کل تک تو ہم اور وہ ہنس بول رہے تھے - اس کے بعد ایک بظاہر غیر متعلق رائے زنی ہے کہ اس شخص کا مرنا بھی ایک تماشا سا ہوگیا ہے - تماشا شاید اس لیے کہ اس نے موت ہی اتنی آسانی سے اور ہنسی خوشی قبول کی جس طرح وہ ہم سے ہنستا بولتا تھا - یا شاید اس لیے کہ اس کی موت بھی اتنی غیر سنجیدہ بلکہ کم وقعت معلوم ہوتی ہے جتنی اس کی زندگی تھی - دونوں ہی برابر کا حکم رکھتی ہیں - یا شاید اس لیے کہ اس کی زندگی تو دوسروں کے لیے تماشا تھی ہی ، موت بھی تماشے کی طرح دل چسپ ، حیرت انگیز یا بے پروا خرامی سے مملو ہے - یا شاید اس لیے کہ وہ اس قدر اچانک اور جلد مر گیا کہ یقین ہی نہیں آتا ، جیسے تماشے پر مکمل یقین کبھی نہیں آتا ، بلکہ make believe کا احساس ہمیشہ کہیں نہ کہیں باقی رہتا ہے - ہم اور وے کی ثنویت اور یہیں کا ابہام شعر کو کسی ایک فردِ واحد کی موت کے زمرے سے اٹھا کر عالمِ انسانی کے بنیادی مظاہر کے درمیان رکھ دیتا ہے -

---

ناصر کاظمی ان کوچوں سے نا آشنا ہیں - ممکن ہے سطحی طور پر انھیں میر کی طرح کا 'حزنیہ شاعر کہہ کر جھگڑا نمٹایا جا سکے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا مزاج میر سے بہت مختلف تھا - ان میں میر کی سی ارضیت بھی نہیں ہے - شیکسپئر کی طرح میر بھی جگہ جگہ ایک عظیم الشان گنوار پن سے کام لیتے ہیں - ان دونوں کی مثال اس بے وقوف لونڈے کی ہے جو ایک گدھے کو سر پر اٹھائے لیے جا رہا تھا - اس کو دیکھ کر علاقے کے رئیس کی بیٹی جو سات سال سے نہ ہنسی تھی ، ہنس پڑی اور رئیس نے خوش ہو کر اسے اپنی فرزندی میں لے لیا - لوگ عام طور پر میر کی ارضیت سے مراد ان کا جنسی اشغال لیتے ہیں لیکن ان کی اصل ارضیت یہی عظیم الشان گنوار پن ہے جس کے دام میں شاعری کی حسینہ بے کھٹکے چلی آتی ہے - ورنہ کیا وجہ ہے کہ وہ قشعریرا جیسا لفظ اتنے دھڑلے سے لکھ جائیں اور پھر بھی شعر کام یاب ہو جائے - میر کی طینت میں استعارہ کچھ اس طرح جاگزیں ہے کہ دیہاتیوں کی خلقی چھٹی حس کی طرح ان کو سیدھی راہ

چلائے ہی جاتا ہے :

معقول گر سمجھتے تو میر بھی نہ کرتے
لونڈوں سے عشق بازی ہنگامِ کہنہ سالی

———

دم ناک میں بہ قولِ زناں عاشقوں کے ہیں
ہلنا بلا ہے موتی کا اس کے بلاق میں

———

اب کچھ مزے پہ آیا شاید وہ شوخ دیدہ
آب اس کے پوست میں ہے جوں میوۂ رسیدہ

———

گریۂ خونیں سے ہیں رخسار میرے لعل تر
دیدۂ خون بار یوں ہیں جیسے منہ پر گھاؤ ہو

———

ٹکڑے جگر کے میرے مت چشمِ کم سے دیکھو
کاڑھے ہیں یہ جواہر دریا کو میں بلو کر

———

میر بلا ناساز طبیعت لڑکے ہیں خوش ظاہر بھی
ساتھ ہمارے راہ میں ہیں پھر ہم سے لڑتے جاتے ہیں

منہ پر گھاؤ والے شعر کو طالب آملی کے شہرۂ آفاق شعر کے سامنے رکھیے تو گنوار پن کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا:

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

طالب کی نفاست پسند طبیعت بند ہونٹوں کی مندمل زخم کی طرح دیکھتی ہے، میر کا دیسی دیہاتی پن خون بہاتی آنکھوں کو چہرے پر زخموں سے تعبیر کرتا ہے، اور وہ بھی ایسے زخم جو مسلسل بہتے ہوئے جاری ہیں، کھلے اور خونیں زخموں میں آنکھیں دیکھ لینا ایرانی مذاق پر (اور شاید ہمارے مذاق پر بھی، جو میر کے مقابلے میں خاصے مہذب ہو چکے ہیں) کس قدر بار گزرے گا۔ لیکن میر نے رخسار کو لعل تر کہہ کر (یعنی

صرف لعل نہ کہہ کر ، بلکہ لعل تر کا ابہامی فقرہ استعمال کرکے) ایک اور استعارہ بنا ہی ڈالا ہے ۔ ناصر کاظمی ایسی جرأت نہیں کر سکے ۔ ان کا لفظی خزانہ ایسے لفظوں سے پر ہے جو اردو شاعری کی روایت کا حصہ ہیں ، مثلاً :

یوں ترے راستے میں بیٹھا ہوں
جیسے اک شمع رہ گزر خاموش

کل دکدوں کے طلسم بھول گئے
وہ تماشا نقاب میں دیکھا

اے دیدہ ورو دیدۂ پرنم کی طرف بھی
مشتاق ہو لعل و زر و گوہر کے تو دیکھو

غیرتِ عشق کو قبول نہیں
کہ تجھے بے وفا کہے کوئی

لیکن وہ دیدۂ پرنم کو لعل و زر و گوہر سے زیادہ نہیں کہہ سکتے ۔ دیدۂ پرنم کو زخمِ نمایاں اور رخِ خون آلود کو لعل تر کہنے کے لیے زمین پر پاؤں مضبوط جمائے رکھنا ضروری ہے ۔

اسی طرح ناصر کاظمی کے کلام میں غالب کے اسلوب کی تلاش کرنے والے نقاد بھی کم کوش اور سطح بین ہیں ۔ درست ہے کہ ناصر کاظمی اردو غزل کے اس اسلوب سے بے گانہ نہیں ہیں کہ فارسیت جس کا طرۂ امتیاز ہے ۔ انھوں نے بعض بہت خوبصورت یا برمحل فارسی تراکیب استعمال کی ہیں ۔ تراکیب سے قطع نظر بھی کیجئے تو ان کے یہاں فارسی مزاج کی شائستگی اور تزئینی پیچیدگی موجود ہے ۔ ہم عصروں میں صرف ظفر اقبال ہی ان سے زیادہ فارسیت کی صفت سے متصف نظر آتے ہیں ۔ ناصر کاظمی کے یہ شعر دیکھیے:

ہر سحر بارگاہِ شبنم میں
پھول ملتے ہیں با وضو ہم سے

ہم سے روشن ہے کارگاہِ سخن
نفسِ گل ہے مشکِ بو ہم سے

ہم سے پہلے زمینِ شہرِ وفا
خاک تھی ، کیمیا ہمیں سے ہوئی

ذرے ہیں ہوس کے بھی زرِ نابِ وفا میں
ہاں جنسِ وفا کو بھی ذرا چھان پھٹک لے

دمِ مہتاب فشاں سے ناصر
آج تو رات جگا دی ہم نے

ابھی وہ دشت منتظر ہیں مرے
جن پہ تحریرِ پائے ناقہ نہیں

صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری
نگاہِ شوق کس منزل سے گزری

بھری برسات خالی جا رہی ہے
سرِ ابرِ رواں دیکھا نہ جائے

یہ فارسیت ان کے مزاج کا خاصہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ صرف اس بنا پر ناصر کاظمی کو غالب کا دست نگر تو کیا ان سے متاثر بھی نہیں کہہ سکتے ۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ، غالب کی عالی دماغی صرف اقبال کے یہاں جھلکتی ہے ، ناصر کاظمی نسبتاً چھوٹے دماغ کے شاعر ہیں ۔ ہزار اصلی اور سچے سہی ، لیکن وہ تجربۂ حیات و کائنات کی بھول بھلیاں میں داخل ہی نہیں ہوئے ، غالب کی طرح اس کے گوشے گوشے سے واقف ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا ۔

ناصر کاظمی اپنے ذاتی کرب کی شدت کے باعث بار بار بودلیئر کی یاد دلاتے ہیں ۔ اس وجہ سے بھی کہ بودلیئر کی ہی طرح شہر کا تذکرہ ان کے یہاں بہت ملتا ہے ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شہر کی رات میں آوارہ گردی ناصر کاظمی کی شعری دنیا میں کلیدی علامت کی حیثیت رکھتی ہے ۔ چونکہ خارج کا عمل دخل ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے ناصر کاظمی کا شہر موہوم بلکہ فرضی شہر ہے جس کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ ناصر کاظمی کی داخلی واردات کا تلازمہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کے نہ صرف خد وخال غیر واضح ہیں اور سوائے رات کے اس کی کوئی پہچان نہیں ہے ، بلکہ یہ بھی کہ اس کا کردار کبھی بدلتا ہی نہیں ۔ رات میں غرق خاموش شہر کا منظر شعر کے بعد شعر میں ایک ہی آہنگ اور تاثر کے ساتھ گزرا چلا جاتا ہے :

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے

یہ زمیں کس کے انتظار میں ہے
کیا خبر کیوں ہے یہ نگر خاموش

شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفاں ہے پردہ در خاموش

تو ہے اور بے خواب دریچے
میں ہوں اور سنسان گلی ہے

شب کی تنہائیوں میں پچھلے پہر
چاند کرتا ہے گفتگو ہم سے

بازار بند راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں
رات کتنی گزر گئی لیکن
اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشیٔ آواز نما کچھ کہتی ہے
میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا
یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے

ان اشعار میں شہر متشکل ہوتا ہے لیکن صرف رات کے حوالے سے اور رات بھی اپنا ایک ہی کردار رکھتی ہے - خاموش ، تھوڑی بہت خوف زدہ ، شاعر کی تھوڑی بہت ہم درد — لیکن شہر ہم دردی سے عاری - بعض شعروں میں رات اور شہر کی تشکیل انھیں خطوط پر ، لیکن ذرا زیادہ انفرادیت آمیز ہو گئی ہے :

کس سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میتِ شہرِ بے کفن

رات بھر ہم یوں ہی رقص کرتے رہیں
نیند تنہا کھڑی ہاتھ ملتی رہے

کیا لگے آنکھ کہ پھر دل میں سمایا کوئی
رات بھر پھرتا ہے اس شہر میں سایا کوئی

میری رات کا چراغ
میری نیند بھی ہے تو

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

رات اور شہر کے کردار میں انفرادیت کا یہ پہلو بھی ناصر کاظمی کے عشق کا مرہونِ منت ہے۔ وہ رات میں ان چیزوں کو تلاش کرتے ہیں جنھیں دن نے ان سے چھین لیا ہے یا جو روشنی میں ان سے کھو گئیں۔ گم شدہ چیزیں انھیں ملتی نہیں ہیں، بلکہ وہ شاید خود ہی کھو جاتے ہیں۔ لیکن رات کا شہر کم سے کم گم شدہ چیزوں کی بازیابی کا امکان تو رکھتا ہے:

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا برنگِ خوابِ سحر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

دوسرے شعر کے مقابلے میں میر کا مشہور شعر دیکھیے تو نقطہ اور واضح ہو جائے گا:

تری گلی میں گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

میر نے وقت کا تعین نہیں کیا ہے اور "سو گیا" کی ذو مفہومی، موت، سکون، سکوت، بے خودی وغیرہ کی کیفیات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ناصر کاظمی کا سفر رات میں شروع ہو کر شاید کبھی تمام نہیں ہوتا۔ نہ جانے کدھر گیا وہ کا اشارہ یہ ہے کہ رات کا بے نوا مسافر گلی میں محوِ خواب یا محوِ مرگ نہیں ہے۔ بے نوائی سکوت یعنی بے لفظی کی طرف بھی لے جاتی ہے اور بے سرو سامانی کی طرف بھی۔ ناصر کاظمی کا شعر تلاش مسلسل کا مضمون رکھتا ہے۔ میر کے یہاں ایک مبہم اختتام ہے۔ رات ناصر کاظمی کی تلاش کا استعارہ ہے جب کہ میر کا شعر اس مخصوص معنویت سے خالی ہے۔

ناصر کاظمی کی طرح بودلیئر کا تصور بھی شہر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لیکن بودلیئر کا پیرس مختلف نظموں میں مختلف رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کہیں وہ شاعر کا دشمن ہے، کہیں وہ ریاکار اور سطحی تماش بین ہے جو اصلی فن کار کا مذاق اڑاتا ہے، کہیں وہ قید خانہ ہے جس میں حسن یا فن محبوس ہے۔ پیرس کا ظاہری نقشہ بھی بدلتا رہتا ہے۔ عمارتیں، سڑکیں، نشاناتِ راہ، یہ سب مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ غائب یا نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ قحبہ خانہ ہو یا slum، بازار ہوں یا محل، بودلیئر کا پیرس خود اسی کے الفاظ میں بھوت کی طرح اس کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔

(۱) کھُردرے فرش پر سونے کی کوشش کرتی ہوئی میری بلی
اپنے سوکھے، ہڈیوں کے ہار جیسے خارش زدہ بدن کو جھٹک رہی ہے
چھتوں کی کھپریل پر کسی بڈھے شاعر کی روح
کسی لرزہ براندام بھوت کی سی درد ناک آواز بلند کرتی ہوئی
بھٹک رہی ہے۔

(۲) اکثر سڑک کے چراغ کی سرخ روشنی میں
جس کی لو اور جس کی چمنی کو ہوا طرح طرح سے اذیت دیتی اور
مارتی ہے
کسی قدیم مضافاتی بستی میں جو کیچڑ آلود بھول بھلیاں کی مانند ہے
اور جہاں انسان اس طرح سڑتے اور پکتے ہیں جیسے برتنوں میں
شراب —

(۳) پالش ادھڑی آرام کرسیوں پر دراز بوڑھی رنڈیاں
زرد رو، نقلی ابروؤں والی، دعوت دیتی ہوئی اور
مہلک آنکھوں والی —
غلیظ چھتوں کے زیر سایہ پیلی چمکیلی ایک قطار
اور بڑے بڑے لٹکتے ہوئے چراغ جو اپنی روشنیاں
مشہور شعرا کی سایہ آلود جبینوں پر ضائع کرتے ہیں
وہ شعرا جو یہاں اپنا خونیں پسینہ ضائع کرنے چلے آئے ہیں

(۴) جب پست، بھاری آسمان
طویل اکتاہٹوں کی شکار سسکتی ہوئی زمین پر کسی ڈھکن کی طرح

جھکا پڑتا ہے اور جب افق کے پورے حلقے کو اپنی گرفت میں لے کر
وہ ہم پر راتوں سے بھی زیادہ غم انگیز ایک سیاہ دن انڈیلنے لگتا ہے ،
جب زمین ایک نم اور چپچپی کال کوٹھری میں بدل جاتی ہے ---

(۵) اے ان گنت چیونٹیوں کی طرح بھل بھلاتے ہوئے شہر
خوابوں سے بھرے ہوئے شہر
جس کا بھوت گزرنے والوں کو دن دہاڑے چمٹ جاتا ہے ---

(٦) قدیم دارلخلافتوں کی پیچ دار گلیوں میں
جہاں ہر چیز حتٰی کہ گھناؤنا خوف بھی ، مسحور کن بن جاتا ہے ---

(۷) باغاتِ عامہ میں کچھ ایسی گلیاں ہیں جن میں فریب شکستہ بلند کوشیاں ،
بدنصیب موجد ، ساقط الحمل شان و شوکت ، ٹوٹے ہوئے دل اور
وہ سب طوفانی ، طوفان زدہ لب و در بستہ روحیں منڈلاتی پھرتی ہیں
جن میں آندھی کی آخری سانسیں اب بھی اترتی چڑھتی نظر آتی ہیں اور
جو کاہل ، خوش باش لوگوں کی توہین آمیز نگاہوں سے دور یہاں آ کر
ُچھپ رہتی ہیں -

(۸) اب وہ پرانا پیرس کہاں ؟ (افسوس صد افسوس
کہ شہروں کی شکل انسانوں کے دلوں سے بھی زیادہ جلد
بدل جاتی ہے -) اب یہاں تو صرف اپنی چشمِ تصور ہی میں وہ
گمٹیاں اور موٹے موٹے نقوش سے منقش
کھمبوں اور لاٹھوں کے انبوہ ، گھاس پھوس ، پتھروں کے بھاری
جسم جو کائی اور نم سے ہرے ہو رہے تھے اور دکانوں کی کھڑکیوں میں
سجی ہوئی طرح طرح کی چمکیلی الّم غلّم چیزیں
دیکھ سکوں گا

(۹) اس طرح یہ اندھے
بے کراں تاریکی سے گزرتے جاتے ہیں، وہ تاریکی
جو ابدی خاموشی کی بہن ہے۔ اے شہر!
اس اثنا میں، جب کہ تو ہمارے گرد نغمہ زن ہے، ہنستا ہے، ٹھٹے مارتا ہے
اور نفرت انگیز ظلم کی حد تک لطف اندوزی پر کمر بستہ ہے
دیکھ، میں بھی انھیں کی طرح گھسٹتا پھرتا ہوں،
بلکہ ان سے بھی بے ہوش و بے خبر، میں کہتا ہوں:
یہ سب اندھے آسماں میں کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟

ظاہر ہے کہ شہر کی یہ بوقلموں منظر کشی، جس میں غیر معمولی استعاراتی، طنزیہ اور جذباتی زور صرف ہوا ہے، ناصر کاظمی کے محدود کینوس سے، جس پر ایک ہی دو مبہم لکیریں ہیں، بہت دور اور بہت ہی آگے ہے۔ بودلیئر کا پیرس خود اسی کی طرح غلیظ، پیچیدہ، جگ مگاتا ہوا، ناقابل فہم حد تک گھرا اور درد آمیز ہے۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ جس طرح پیرس کے بغیر بودلیئر کا تصور محال ہو جاتا ہے اور جس طرح پیرس کے زمین و آسماں موسم اور منظر، سب بودلیئر کے شاعرانہ تجربے کا جز و لاینفک ہیں، اسی طرح سنسان شہر میں آوارہ گرد کو قبول کیے بغیر ناصر کاظمی بھی ہاتھ نہیں آ سکتے۔ دونوں نے ہی اپنے ذاتی کرب کے اظہار کے لیے شہر کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ ناصر کاظمی کے یہاں اس استعارے کی پشت پناہی خالی گھر اور خاص کر ایسے خالی گھر کے ذریعہ ہوئی ہے جس میں پہلے کوئی رہا کرتا یا آیا کرتا تھا۔ یہ خالی گھر گویا اس رات کے شہر کا استعارہ ہے جس میں ناصر کاظمی کی کوئی محبوب چیز گم ہو گئی تھی:

کسے ڈھونڈو گے ان گلیوں میں ناصر
چلو اب گھر چلیں دن جا رہا ہے

استعارہ در استعارہ کا یہ منظم اظہار ناصر کاظمی کے محدود تجربے کو غیر معمولی قوت بخش دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی دنیا کی تنگی میں قاری کا دم نہیں گھٹتا۔ رات کا سنسان شہر یا شہر کی سنسان رات اور وہ خالی گھر جو اپنے مکینوں کو ترستا اور ان کے لیے تڑپتا ہے ایک شدید ذاتی

المیے کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں - یہی ناصر کاظمی کا اہم ترین کارنامہ ہے:

میرا دیا جلائے کون
میں ترا خالی کمرہ ہوں

تو جہاں چند روز ٹھہرا تھا
یاد کرتا ہے تجھ کو آج وہ گھر

تیرے ساتھ گئی وہ رونق
اب اس شہر میں کیا رکھا ہے

چیخ رہے ہیں خالی کمرے
شام سے کتنی تیز ہوا ہے

دروازے سر پھوڑ رہے ہیں
کون اس گھر کو چھوڑ گیا ہے

تو جہاں ایک بار آیا تھا
ایک مدت سے ہے وہ گھر خاموش

اُٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

اس بات کی وضاحت شاید چنداں ضروری نہ ہو کہ اکیلا گھر، سنسان راستہ،

رات کا شہر ، یہ سب آخرکار خود ناصر کاظمی کا استعارہ ہیں اور میرے مرکزی خیال کی پشت پناہی کرتے ہیں کہ ناصر کاظمی کے اسلوب کا اچھوتا پن در اصل یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اور صرف اپنی بات کہی ہے۔ وہ خارج سے اتنے بے خبر نہیں ہیں جتنے بے نیاز ہیں۔ ان کی آواز میں وہ عمومیت یا دوسرے الفاظ میں آفاقیت نہیں ہے جو عام طور پر عشقیہ شاعری کا خاصہ ہے۔ ان کی آپ بیتی کا جگ بیتی سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہی اس کی بنیادی قوت ہے اور یہ ان کی اچھوتی بڑائی ہے کہ انھوں نے اپنی حدیں بہ خوبی پہچان لیں اور ان کو پار کرنے کی کوشش میں زیادہ وقت ضائع نہ کیا۔ اجتماعی زندگی پر رائے زنی یا تفکراتی انداز سخن انھوں نے بہت کم اختیار کیا ، اور جب بھی اختیار کیا ناکام ہی رہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کی نثریت اپنی دلیل آپ ہے۔

کسی کا درد ہو دل بے قرار اپنا ہے
ہوا کہیں کی ہو سینہ فگار اپنا ہے

———

ہر کوئی اپنے غم میں ہے مصروف
کس کو درد آشنا کہے کوئی

کون اچھا ہے اس زمانے میں
کیوں کسی کو برا کہے کوئی

———

پیارے دیس کی پیاری مٹی
سونے پر ہے بھاری مٹی

———

پریشان چیزوں کی ہستی کو تنہا نہ سمجھو
یہاں سنگ ریزہ بھی اپنی جگہ اک جہاں ہے

اگر "برگِ نے" میں سپاٹ جذبات والے شعر نمایاں ہیں (جذباتیت سے مراد یہ ہے کہ جذبہ معمولی یا کم پیچیدہ ہو لیکن الفاظ اس کے لیے ایسے استعمال ہوں جو ضرورت سے زیادہ ہوں ، گویا مچھر مارنے کے لیے پچاس من کا ہتھوڑا

استعمال کیا جائے - کلی اینتھ بروکس نے اس موضوع پر اچھی بحث کی ہے کاش ہمارے نام نہاد نرم لہجہ اور جذبے کی تھرتھراہٹ سے بھربور پوپلی شاعری کرنے والے شعرا نے اس بحث کا مطالعہ کیا ہوتا) تو "دیوان" میں پھیکے سیٹھے فلسفیانہ ، حکیمانہ ، تفکراتی بہروپ دھارے ہوئے نثری بیانات دکھائی دیتے ہیں - "برگِ نے" کے یہ اشعار جذباتیت کی مثال ہیں :

آتشِ غم کے سیلِ رواں میں نیندیں جل کر راکھ ہوئیں
پتھر بن کر دیکھ رہا ہوں آتی جاتی راتوں کو

———

کرم اے صرصرِ آلامِ دوراں
دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے

———

سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ

دوسرے شعر کے مقابلے میں میر اور بیدل کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ چھوٹی بحر کے باوجود ناصر کاظمی کا شعر کثرت الفاظ کا شکار ہے - صرصرِ آلام دوراں سے کرم کی فرمائش کرنا محض سستی جذباتیت ہے ، کیونکہ جو کہنا تھا وہ تو دوسرے مصرع میں کہہ دیا گیا ہے - اس کے علاوہ آگ بجھنے اور صرصر میں کوئی مشابہت نہیں ہے - صرصر سے چراغ بجھ سکتا ہے لیکن آگ تو بھڑک اٹھتی ہے - بیدل اور میر نے اسی لیے جنبش داماں کا مناسب حال پیکر رکھا ہے -

بیدل : آتشِ دل شد بلند از کفِ خاکسترم
باز مسیحائے شوق جنبشِ دامانِ کیست

میر : افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

خیال اور الفاظ کی واضح بازگشت کے باوجود افسردگی ، سوختہ جاناں ، جنبشِ داماں ، کف خاکستر ، آتشِ دل اور مسیحائے شوق جیسے علامتی اور

استعاراتی الفاظ کے فقدان نے ناصر کاظمی کو محض سستی درد انگیزی تک محدود کر دیا ۔ "دیوان" کی بڑی خوبی اور ناصر کاظمی کا کمال یہ ہے کہ اس میں جذباتیت کا دور دورہ بہت کم ہے کیونکہ ذاتی الم ناکی کا تشخص شدید ترین ہوگیا ہے اور نام نہاد فلسفہ طرازی کی کوشش بھی برائے نام ہی کی گئی ہے ۔ جارج ہربرٹ کی طرح ناصر کاظمی نے بھی اکثر و بیش تر اپنے محدود علاقے کی کاشت اعلیٰ ترین طریقوں سے کی ہے ۔

"پہلی بارش" کی جو غزلیں اورینٹل کالج کے رسالے میں شامل ہیں ان میں بھی اجتماعی زندگی کے نقوش حسب معمول دھندلے ہیں لیکن اس طور کی خفیف سی جھلک نظر آتی ہے ۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ناصر کاظمی کی دنیا میں، جو ابھی تک صرف ان سے آباد تھی، اب ان کے محبوب کے خد و خال نمایاں ہونے لگے ہیں ۔ یہ درست ہے کہ محبوب کو ابھی بھی ناصر کاظمی کی ہی آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے، لیکن جو شخصیت پچھلے سارے کلام میں بس کہیں کہیں اپنا اظہار کر سکی تھی، اب کچھ بے نقاب ہو چلی ہے :

دھوپ کے لال ہرے ہونٹوں نے
تیرے بالوں کو چوما تھا

تیرے عکس کی حیرانی سے
بہتا چشمہ ٹھہر گیا تھا

اک رخسار پہ زلف گری تھی
اک رخسار پہ چاند کھلا تھا

ٹھوڑی کے جگ مگ شیشے میں
ہونٹوں کا سایہ پڑتا تھا

چندر کرن سی انگلی انگلی
ناخن ناخن ہیرا سا تھا

ایک پاؤں میں پھول سی جوتی
ایک پاؤں سارا ننگا تھا

روشنی کے پیکر اس کثرت اور ندرت سے شاید ہی کبھی صورت تراشی کے لیے کام میں لائے گئے ہوں۔ ان غزلوں میں پیکر علامت کے شانہ بہ شانہ چلتا نظر آتا ہے۔ مثلاً آخری غزل کے کچھ شعر ہیں :

پیاسی کونجوں کے جنگل میں
میں پانی پینے اُترا تھا

ہاتھ ابھی تک کانپ رہے ہیں
وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا

آنکھیں اب بھی جھانک رہی ہیں
وہ پانی کتنا گہرا تھا

گہری گہری تیز آنکھوں سے
وہ پانی مجھے دیکھ رہا تھا

کتنا چپ چپ کتنا گم سم
وہ پانی باتیں کرتا تھا

اس غزل کا منظر نامہ کسی غیر سیارے سے آنے والے اسٹرونانٹ کی اچانک زمین تک رسائی سے شروع ہو کر انسان کے کشف ذات اور خواب کی طلسماتی فضا کو اپنے گھیر میں لے لیتا ہے۔ مرکزی علامت تو پانی ہے، لیکن اپنے مخصوص طریقِ کار کے مطابق ناصر کاظمی کا "میں" جو جنگل میں (جہاں پرند پیاسے ہیں) پانی پینے اترا ہے، ٹھنڈے گہرے چپ چاپ لیکن لفّاظ پانی کو کئی جہتیں عطا کر دیتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس "میں" کے بغیر پانی شاید محض پانی رہ جاتا۔ نئے تجربات، کشف، خوف غیر مرئی شے میں مرئی زندگی، بے جان میں روح، چشمۂ حیات (جس سے پیاسی چڑیاں احتراز کرتی ہیں کیونکہ وہ تا ابد زندہ رہنے کے خطرات و عواقب سے آشنا ہیں)، کسی غیر انسانی ذہن کا انسانی اور دنیاوی حقائق سے تعارف، یہ سب اشارے جو پانی کے تسلسل نے خلق کئے ہیں "میں" کی معنویت کے بغیر دھندلے یا ادھورے رہ جاتے۔

ناصر کاظمی کی شاعری کا جو رجحان ماضی میں تھا اس کو دیکھتے

ہوئے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ علامتی ذہن کی طرف بھی گام زن ہو سکیں گے - لیکن ہمیشہ کی طرح انھوں نے یہاں بھی اپنے شاعرانہ ارتقاء میں ایک غیر متوقع منزل سر کرکے ہم سب کو متحیر کر دیا - ان غزلوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ناصر کی بے وقت موت اس سے کہیں بڑا حادثہ تھی جتنا کہ ہم لوگ سمجھے تھے - انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا :

میری نوائیں الگ میری دعائیں الگ
میرے لیے آشیاں سب سے جدا چاہیے

* * *

سرسوں کے پھول کا ہم عصر

سہیل احمد

[جب چلتے چلتے ہنگامِ زوال آیا ، دل نڈھال ہوا اور حال بے حال ہوا - ایک سوار نے سمندِ عزم کی باگ چھوڑی اور بولا اس بیاباں میں سفر بے اثر ہے ، خاک پھانکنا بے ثمر ہے - تقاضا وقت کا اور مصلحت موقع کی یہ ہے کہ آگے جانے کا خیال ترک کریں اور پلٹ کر بچھڑوں سے جا ملیں -

ہم سفر بولا کہ جس رستے کو ہم نے چھوڑا وہ ہم پر بند ہوا - آگے کی راہیں کھلی ہیں ، شوقِ سفر شرط ہے اور ہر قدم راستہ بھی ہے اور منزل بھی -

انھوں نے باگیں سنبھا لیں اور پھر چلنا شروع کر دیا ، اوپر تانبا آسمان ، نیچے چٹیل میدان ، سنسان بیابان ، دھوپ میں جلتے بلتے پتھریلے ٹیلے ، ریت کے رستے ، اکا دُکا بے برگ درخت ، کوئی راہ گیر نظر نہ آیا کہ سراغ منزل کا لیتے اور پتا پانی کا پاتے - دور کبھی دھول اُڑتی نظر آتی تو خیال گزرتا کہ اس دشتِ بے آب میں اور مسافر بھی ہیں کہ اپنے طور کڑے کوسوں کا سفر کرتے ہیں ، دن ڈھلنے لگا تو دل فزوں نڈھال ہوا - گلا پیاس سے خشک ہوا اور ابلق پسینے میں شرابور اور تھکن سے چُور ہوئے کہ اتنے میں سر پہ پیاسی آوازوں کی لکیر ہویدا ہوئی ، دیکھا کہ قازوں کی ایک قطار ہے کہ قائیں قائیں چیختی ہے اور فضا میں تیرتی جاتی ہے - اس آواز کو انھوں نے غیب کی ندا جانا اور پانی کا پیغام سمجھا ، گھوڑوں کو ایڑ دی اور قازوں کی ندا کے ہم رکاب یوں

سرپٹ دوڑے کہ ابلقوں کی ٹاپوں سے دشت گونجا اور چنگاریاں اڑیں -]

یہ اقتباس ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے ایک مطبوعہ مکالمے کا پیش لفظ ہے ، اس گفتگو میں ، جسے "نیا اسم" کا نام دیا گیا ہے ، ناصر کاظمی اور انتظار حسین نے اپنے عصر کی ویرانی ، فطرت سے انسان کی دوری اور اپنے عہد کے لیے نئے استعاروں کی تلاش کا ذکر کیا ہے ، یہی اقتباس ناصر کاظمی کی شاعری کا حرفِ آغاز بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ ناصر کاظمی کی شاعری کی داستان پورے عہد کے خرابے اور بیابان میں تبدیل ہونے ہی سے شروع ہوتی ہے - یہ شاعری پانی سوکھ جانے کے بعد پیاسی آوازوں کے ہم رکاب نئے چشموں کی تلاش کا سفر ہے - ''برگِ نے'' کی ابتدائی غزلوں کا شاعر اس مقام پر کھڑا ہے جہاں ایک بہت بڑا ماجرا گزر چکا ہے ، "برگِ نے" کی ان غزلوں میں "رفتگاں" کا اسم اسی بات کی شہادت دیتا ہے کہ شاعر کی داستان ایک عہد کے گزر جانے سے شروع ہوتی ہے - ان غزلوں میں قافلوں کے رکنے اور چلنے ، آشیانوں کے جلنے اور لوگوں کے بچھڑ جانے کا تذکرہ ہر آن چھڑا رہتا ہے ، ہجرت اور ۱۹۴۷ء کے فسادات کے تناظر میں انھی رویّوں کی وجہ سے ناصر کی غزل نئے طرزِ احساس کی نقیب بنی تھی اور اسی تناظر میں "قافلے" ، "آشیاں" اور "رفتگاں" جیسے لفظوں نے نئے معنی پائے تھے - احساساتی اور تہذیبی پس منظر کے اسی اشتراک کی وجہ سے ناصر کاظمی کو اپنا عہد میر کے عہد سے مماثل دکھائی دیا ، ہجرت اور فسادات کے پس منظر میں محمد حسن عسکری نے ناصر کاظمی کی شاعری کو "ساقی" میں اپنے ادبی کالم "جھلکیاں" میں نئے طرزِ احساس کی ترجمان قرار دیا - اس میں شک نہیں کہ ناصر کاظمی ہمارے عہد کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جن کے لیے ہجرت کا مسئلہ مرکزی مسئلہ بنا - عسکری صاحب نے آغاز ہی میں ناصر کی شاعری کی حقیقی روح کو پہچان لیا تھا لیکن پھر یوں ہوا کہ ایک طویل عرصے تک ہمارے نقّادوں نے ناصر کی شاعری کو اسی تحریر کے حوالے سے پہچانا اور شاعر کو اسی ابتدائی شاعری کے تناظر ہی میں اسیر کرنے کی کوشش کی حتٰی کہ جو چند شعر عسکری صاحب نے چنے تھے ان کی تکرار بھی زور و شور سے ہوئی ، یہ اور بات ہے کہ عسکری صاحب نے کچھ عرصے بعد ''جھلکیاں'' کے ضمن ہی کی ایک دوسری تحریر میں اس بات کا شکوہ

کیا تھا کہ لوگوں نے ناصر کے طرزِ احساس کو نئی غزل لکھنے کا "نسخہ" بنا لیا ہے اور اسی سانچے کی تکرار کیے جا رہے ہیں جب کہ ناصر اس مقام سے آگے سفر کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ خیر عسکری صاحب کے رجحان بدلنے کی خبر اُن کے مقلدین کو ہمیشہ دیر ہی سے ہوتی ہے، کہنے کی بات صرف اتنی سی ہے کہ ناصر کی شاعری پر لکھے گئے ابتدائی مضامین اُس کی شاعری کے محض ایک حصے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں جب کہ بعض ادبی اور خصوصاً درسی حلقوں میں ناصر کو انھی مضامین کے حوالے سے سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف ناصر کاظمی کی شاعری پر لکھے گئے نئے مضامین زیادہ تر ناصر کاظمی کی شاعری میں سے اپنی پسند کا ناصر کاظمی تلاش کرنے کی کوششیں ہیں۔ وزیر آغا، جیلانی کامران، سجاد باقر رضوی، احمد ندیم قاسمی اور بہت سے دوسرے اصحاب کی طویل اور مختصر تنقیدی تحریروں میں یہی رجحان کارفرما نظر آتا ہے۔ جہاں ناصر کے پرانے نقّادوں کے مداح اس حقیقت کو فراموش کرتے رہے کہ اچھا شاعر تمام عمر ایک ہی مقام پر ٹھہرا نہیں رہتا وہاں نئے نقّاد اس بات کو ماننے سے گریزاں نظر آتے ہیں کہ ناصر کاظمی کے ذہن کی ساخت اُن کے ذہن سے علیحدہ تھی۔ ان مضامین میں ناصر کاظمی کو کسی طرح اپنے فکری دائرے میں لے آنے کی بے تابی یوں چھلکتی ہے جیسے کوئی چھت پر کھڑا کبوتر کو گھیر کر اپنی چھت پر بٹھانے کی کوشش میں مصروف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں ناصر کی شاعری کے ساتھ کسی حقیقی وابستگی کا سراغ نہیں ملتا، ان علمی مضامین کے مقابلے میں مجھے تو منیر نیازی کی ایک بے حد مختصر تحریر زیادہ وقیع نظر آتی ہے جہاں ایک شاعر دوسرے شاعر کے بارے میں بات کرتا نظر آتا ہے۔

"میں اُس کی شاعری کو ایسے پہچانتا ہوں جیسے کوئی دوسرے کے درد سے اپنے درد کو جانتا ہے۔"

(مضمون مطبوعہ ''کتاب'' لاہور)

اس صورتِ حال میں ناصر کے درد کو جاننے کے لیے ناصر کے نقّادوں سے نہیں خود ناصر کاظمی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ جب تک ناصر کاظمی کی شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں ''برگِ نے'' اور ''دیوان'' کے ساتھ ساتھ اُس کی چوبیس غزلوں کے سلسلے ''پہلی بارش''، اُس کی منظوم ڈرامائی کتھا

''سر کی چھایا'' اور اُس کی نثری تحریروں بالخصوص انتظار حسین، شیخ صلاح الدین اور حنیف رامے سے اُس کے مطبوعہ مکالموں کو جگہ نہ دی جائے اُس وقت تک ناصر کاظمی کی شاعری کا مجموعی مزاج سمجھا نہیں جا سکتا۔

اب جب کہ ناصر کاظمی کی شاعری کو جدید علمی اور سیاسی اصطلاحوں میں سمجھا جا رہا ہے تو کیا ہرج ہے کہ ناصر کی شاعری کو خود اُس کی زندگی اور اُس کی اپنی دل چسپیوں کے دائرے کے ساتھ مربوط کر کے دیکھا جائے۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ اس شاعری کو شاعر کی سوانح حیات کے مختلف واقعات کے ساتھ زبردستی منسلک کر دیا جائے۔

''اس رجحان سے مظفر علی سیّد جیسے محتاط نقّاد بھی نہیں بچ سکے۔ جہاں ایک طرف وہ اپنے مضمون "کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا" میں ناصر کاظمی کی پوری ادبی سوانح کا احاطہ کرتے دکھائی دیتے ہیں وہاں دوسری طرف اپنے ایک اور مضمون (مطبوعہ ''فنون'') میں وہ ناصر کی ایک غزل "رہِ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ''پا شکستہ غزالِ حرم صبر کر صبر کر'' کے مصرعے کو شاعر کے سکوٹر کے حادثے کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں۔''

یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں ذات سے مراد ذات کا وہ وسیع تر تصوّر ہے جو ایک ثقافتی گرد و پیش میں بڑھتا اور پھلتا پھولتا ہے اور جس کی تشکیل میں پورے عہد کا مزاج شامل ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام سے کسی خاص علم یا نظریے کے جواز کے لیے مواد فراہم کیا جا سکتا ہے، کسی خاص علم یا نظریے کا اثر اُس کے شعر پر کیا ہوا یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن اُس کی تخلیق کے محرکات کا جائزہ لینے کے لیے اُس کی ذات کے اس وسیع تر پس منظر کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔

ناصر کاظمی کا اپنی ذات کے بارے میں جو تصوّر تھا وہ اپنے عہد کی مروجہ شعری شخصیت سے علیحدہ نظر آتا ہے پھر اُس کی تشریح مروجہ حوالوں سے کیسے کی جا سکتی ہے۔ ہمارے عہد کے اکثر شاعروں نے خود کو ایک مسیحا کے روپ میں دیکھا ہے، صلیب اور دار و رسن کے تلازمات جدید نظم اور غزل میں بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح حق گوئی کی

پاداش میں سزا پانے کے تصوّر نے منصور اور سقراط کے استعاروں کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔ ناصر کاظمی کے یہاں یہ استعارے اور اس طرح کے تلازمات کہیں مشکل ہی سے ملیں گے، بلکہ ناصر نے تو اپنی شاعری کے ساتھ "قلم" اور "کاغذ" یا لکھنے کا تلازمہ بھی کم ہی استعمال کیا ہے۔ ناصر نے خود کو زیادہ تر گانے والے یا بنسری پر دُھن الاپنے والے کے روپ میں دیکھا ہے اور شاعری کا تصوّر اُس کی لغت میں کہنے اور سنانے کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ شاعر کا وہ تصوّر ہے جس پر پرانے زمانوں کے کوی یا بربط پر گانے والے شاعر اور پرو وانس کے ترب دار ہی پورے اُتر سکتے ہیں:

"اس معاملے میں ناصر اپنے قریب ترین شاعروں سے بھی علیحدہ نظر آتا ہے۔ ناصر کاظمی کے شعری سلسلے کے اہم ترین نمائندے اور طرزِ احساس میں اُس کے نزدیک ترین شاعر احمد مشتاق کی شاعری میں بھی شاعری کا تصوّر لکھنے کے ساتھ منسلک ہے":

ہاتھ کاغذ پہ دھرے بیٹھا ہوں
شعر آ آ کے پلٹ جاتے ہیں

جی بھر آیا کاغذِ خالی کی صورت دیکھ کر
جن کو لکھنا تھا وہ سب باتیں زبانی ہوگئیں

خود "نے" کا لفظ اقبال کے بعد ناصر کے علاوہ شاید ہی کسی شاعر نے اس کثرت سے استعمال کیا ہو۔ اسی طرح عملِ تخلیق کی معنویت کے سلسلے میں بنسری بجانے والے کا استعارہ اُس کی نثر میں بھی کئی مرتبہ ظاہر ہوتا ہے اور شعر کے ساتھ "موسیقی" کا تلازمہ بھی کئی مرتبہ ظہور کرتا ہے:

کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینۂ نے میں چھپا دی ہم نے

تو اسیرِ بزم ہے ہم سخن تجھے ذوقِ نالۂ نے نہیں
ترا دل گداز ہو کس طرح یہ ترے مزاج کی لے نہیں

سیری نے سے مہکتے ہیں کوہ و دمن
میرے گیتوں کا دیوانہ پن پھول ہے

———

اُداس بیٹھے ہو کیوں ہاتھ توڑ کر ناصر
وہ نے کہاں ہے جو تاروں کی نیند اُڑاتی تھی

———

"بیس برس پہلے اسپین میں ایک لڑکا گٹار بجاتا تھا اور شعر کہتا تھا وہ بھی میرا ہم عصر ہے۔"
(میرا ہم عصر ، مذاکرہ ، مطبوعہ ادبِ لطیف)

"اب کوئی یہ کہے کہ دنیا کے کام چھوڑ کر ادب ہی کیوں تخلیق کیا جائے تو اُس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ انسان کے پاس ذہن ہے ، تصوّر ہے ، یادوں کا خزانہ ہے اور نا آفریدہ مستقبل کے خواب وہ ان ہیولوں کو جسم دینا چاہتا ہے جب تک انسان میں یہ صلاحیتیں ہیں تخلیق کا سرچشمہ رک نہیں سکتا ۔ اُس سر پھرے کو دیکھیے جس نے بانسری ایجاد کی تھی ۔ آخر اس کی کیا ضرورت تھی ؟ بانسری کو کس آئیڈیالوجی نے جنم دیا تھا ۔" ("نیا اسم" مکالمہ ، مطبوعہ نیا دور)

روایت پر گفتگو کرتے ہوئے ("خوشبو کی ہجرت" مطبوعہ "سویرا") ناصر نے موسیقی اور مصوّری کو شاعری کی آنکھیں قرار دیا ، اسی طرح "نیا اسم" میں اُس نے انیس کو تصویریں دکھانے والا اور شاغال کو کہانیاں سنانے والا کہا ۔ اس طرح ناصر کے محاورے میں شاعری مصوری اور موسیقی کی حدود ملتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ ناصر کی تصویروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کا تصویر سازی کا تصوّر بھی اُسی کے لفظوں میں بیان کر دیا جائے :

"میں نے تصویریں دیکھنے سے پہلے How to look at pictures کے قسم کے نسخے نہیں پڑھے ، تصویریں دیکھنا مجھے انیس نے سکھایا :

نکلے خیمے سے جو لے کر علی اصغر کو حسین[۴]

مرثیہ شروع ہوتے ہی سننے والا کربلا کے میدان میں پہنچ جاتا ہے ۔ مصوّروں میں سب سے پہلے شاغال کی تصویروں نے مجھے ان گنت کہانیاں اور نغمے سنائے ہیں ۔ ایک تصویر کی کہانی سنو، ایک پہاڑی پر چھوٹی سی بستی ہے کہ برف سے ڈھکی ہے، گہرے رنگوں کی خاموشی پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہ آدھی رات کا سماں ہے، لوگ لحافوں میں میٹھی نیند سو رہے ہیں، درختوں کی ننگی شاخیں آپس میں اُلجھ رہی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ برف گر رہی ہے ۔ برف کی سطح پر ایک قدم کا نشان ہے اور ایک بے برگ درخت کے نیچے ایک نغمہ گر گرم کپڑوں میں تنہا بیٹھا ہے ۔ یہ نغمہ گر ابھی جوان تھا کہ ایک رات برف باری کی رات کو اس بستی میں وارد ہوا ۔ ایک گھر کے دریچے سے کسی نے دیکھا اور سوچا غریب مسافر ہوگا اسے اپنے گھر مہمانِ عزیز کرو ۔ اس گھر میں ایک لڑکی رہتی تھی، دونوں راتوں کو باہر نکلتے تھے ۔ وہ گاتی یہ ساز بجاتا ۔ ایک رات اُسے برف باری نے کھا لیا ۔ اُس دن سے آج تک اس کا یہ طور ہے کہ برف گرنی شروع ہوئی اور ادھر اس نے ساز سنبھالا ۔"

ناصر نے تصویر سے جو کہانی بنائی ہے اُس کے حوالے سے بھی ناصر کے پسندیدہ موتیف سامنے آتے ہیں ۔ اگر کسی کا جی چاہے تو وہ ناصر کی تصویروں کو بھی کہانیوں میں تبدیل کر سکتا ہے ۔ یاد اور فینٹسی ناصر کی شاعری کے دو اہم عناصر ہیں ۔ یادیں "اثاثہ" ہیں اور فینٹسی نا آفریدہ زمانوں کے خوابوں کی صورت دور دور کی خبر دیتی ہے ۔ اب ذرا ناصر کی کچھ تصویریں بغیر کہانیوں کے دیکھ لیں :

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

پہلی بارش ، میں اور تو　　زرد پہاڑوں کا دامن
پیاسی جھیل اور دو چہرے　　دو چہرے اور اک درپن

ان تصویروں کے ساتھ "پہلی بارش" کے سلسلے کی بے شک ساری غزلیں ہی شامل کر لیں ، ناصر کہانیاں کہتا ہوا نظر آئے گا۔

ناصر کے ذہن کی ساخت میں حکایاتی اور اساطیری عناصر کو خاص مقام حاصل ہے۔ ہر شاعر اپنے تجربوں اور اپنے دکھ سکھ کے اظہار کے لیے بعض مخصوص وضعیں (پیڑن) بناتا ہے ، انھی وضعوں سے اُس کی شاعری کی مجموعی شکل بنتی ہے۔ ناصر نے حکایاتی اور داستانی وضعوں کو اپنے تجربے سے ہم آہنگ جانا ہے اور اس طرح اپنے تجربے کو اجتماعی تخیّل کے تناظر میں لا کر دیکھا ہے۔ ناصر کی غزلوں میں رنجِ سفر ، گل زمینیں ، سراغِ گل ، شبِ چراغ ، شہرِ گل ، شہرِ بے چراغ ، رنجِ غربت ، ساتواں در ، کرن پریاں اور اسی طرح کے الفاظ اور پھر سفر پر بار بار اصرار ان وضعوں کی صورت سامنے آتے ہیں۔ یہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ناصر کی شاعری کے اکیلے گھر ، خالی شہر ، دھوپ میں جلتی گلیاں اور کھلے دریچے بھی ایک سطح پر تہذیبی مفہوم رکھتے ہیں اور زیریں سطح پر حکایاتی تمثالوں کو سامنے لا کر ایک لخت لخت داستان کے مختلف ٹکڑے سمیٹنے کی کوشش ہیں۔ تخلیقی آدمی کے لیے ناصر نے اپنی نثر میں ڈار سے بچھڑے ہوئے زخمی ہرن کا استعارہ بھی کئی باراستعمال کیا ہے۔ یوں تو اجتماعی تخیّل کے نقوش کسی نہ کسی شکل میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مل سکتے ہیں کیونکہ یہ نقوش تخیّل کے لیے لہو کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ناصر کی شاعری میں یہ وضعیں محض چند جگہ ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ یہ اُس کے تخیّل کے بنیادی نقوش کا درجہ رکھتی ہیں۔ ناصر کے ''سراغِ گل'' یا ''شبِ چراغ'' کو سمجھنے کے لیے انتظار حسین کی دو مختصر حکایات دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ دونوں حکائتیں ناصر نے رسالہ ''ہمایوں'' کی ادارت کے زمانے میں شائع کی تھیں۔ پہلی حکایت "سراغ میں گل کے" ہے جو پھول شہزادی کے گم ہونے کے بعد شہر میں ماتمی کیفیت کی وجہ سے چراغ جلائے جانے کی ممانعت کے بعد کی صورتِ حال بیان کرتی ہے۔ اس حکایت کو ناصر کاظمی نے ''ماہِ نو'' سے نقل کر کے ''ہمایوں'' میں شائع کیا۔ دوسری حکایت جو ''ہمایوں'' میں شائع ہوئی ''شبِ چراغ'' ہے۔

ان حکایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں انتظار حسین اور ناصر کاظمی اپنے تجربات کو حکایاتی حوالوں سے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے - یہ حکایاتی وضعیں ناصر کی ''نشاطِ خواب'' میں زیادہ مربوط طریقے پر ظاہر ہوتی ہیں - کچھ شعر دیکھ لیجیے :

سچ سچ کا اک مکان پرستان کہیں جسے
رہتی تھی اُس میں ایک پری زاد پدمنی

اونچی کھلی فصیلیں ، فصیلوں پہ برجیاں
دیواریں سنگِ سرخ کی دروازے چندنی

جھل جھل جھلک رہے تھے پسِ چادرِ غبار
خیمے شفق سے لال چتر تخت کندنی

فوارے چھوٹتے ہوئے مرمر کے صحن میں
پھیلی تھی جن کے گرد گلِ بانس کی بنی

ہر بوستاں کے پھول تھے اُس عیش گاہ میں
ہر دیس کے پرندوں نے چھائی تھی چھاؤنی

جھرسٹ کبوتروں کے اُترتے تھے رنگ رنگ
نیلے ، اُجال ، جوگیئے ، گلدار ، کاسنی

پٹ بیجنا سی انکھڑیاں ، گل چاندنی سے تاج
چونچوں میں خس کی تیلیاں ، پنجوں میں پنجنی

سارنگیاں سی بجتی تھیں جب کھولتے تھے پر
یک بار گونج اُٹھتی تھی سنسان کنگنی

استادہ اصطبل میں سبک سیر گھوڑیاں
ٹاپوں میں جن کی گرد ہو گردونِ گردنی

رہتی تھی اس نواح میں ایسی بھی ایک خلق
پوشاک جس کی دھوپ تھی خوراک چاندنی

کل رات اس پری کی عروسی کا جشن تھا
دیکھی تھی میں نے دور سے بس اُس کی روشنی

جم راج ، دیو ، دیویاں ، جنات ، آدمی
بیٹھے تھے زیب تن کیے ملبوسِ درشنی

حکایاتی وضعوں کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی کے تخیّل کی ساخت میں مقامی وضعیں بھی بار بار ظاہر ہوتی ہیں ۔ یہ وضعیں ناصر کاظمی کے بچپن ، اُس کے آبائی شہر ، چھوٹی عمر میں دیکھے ہوئے قصبوں اور اس ساری فضا کے ثقافتی ورثے سے منسلک ہیں ، یہ وضعیں ایک ایسے ثقافتی علاقے سے پیوست ہیں جہاں ہندی اور عجمی مزاج آپس میں ملتے ہوئے نظر آتے ہیں ، ناصر کاظمی نے میر کے ساتھ جو ہم آہنگی محسوس کی اُس میں مزاج کی مماثلت کے ساتھ ساتھ زبان کا وہ شعور بھی ہے جو ہندی مزاج کو عجمی مزاج کے ساتھ ملا دیتا ہے ۔ ناصر کی شخصیت کے پیچھے جو ثقافتی علاقہ دکھائی دیتا ہے اُس میں دوہے ، بھجن ، گیت ، لوریوں ، پہیلیوں اور لوک گیتوں کی روایت غزل کی روایت کے ساتھ ساتھ نظر آتی ہے ۔ ناصر کی منظوم کتھا ''سر کی چھایا'' کو موضوع اور پیش کش کے اسلوب سے قطع نظر اس وجہ سے بھی پڑھا جانا چاہیے کہ یہ ناصر کے لسانی شعور کی اُس سطح کو مربوط انداز میں سامنے لاتی ہے جو غزلوں میں کہیں زیریں لہر کی طرح موجود ہے ۔ اس ''کتھا'' میں مختلف رسوم ، تہوار اور میلے وغیرہ مل کر بچپن کے ''ثقافتی اساطیر'' کو سامنے لاتے ہیں ۔ ہندی گیت اور دوہے کی روایت بھی ناصر کے لیے کشش کا باعث رہی ہے ۔ میرا بائی کو اس نے اپنی نثر میں ہمیشہ ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ اُداسی کے رویے کو سمجھنے کے لیے اُس نے اُداسی کو میرا بائی کی بہن کہا اور اُداسی کو آج کی آسائیشوں پر محاکمہ اور آج کا بھجن قرار دیا ۔ (مضمون "میرا بائی کی بہن" مطبوعہ ''نصرت'') ۔ یہاں ناصر کاظمی نے اُداسی کو مقدّس بنا دیا ہے کیونکہ زر پرستی کے پیچھے بھاگنے والے معاشرے میں "اُداسی" اور ''تنہائی'' معاشرے کے گھناؤنے ماحول سے پناہ دیتے ہیں ۔ ناصر نے اُداسی کو ''خود آگہی'' کی طرف پہلا قدم قرار دیا ہے ، یوں اُس کے نزدیک یہ اُداسی کوئی ذاتی اُداسی نہیں بلکہ تخلیقی لوگوں کی مشترکہ تقدیر ہے ۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ اب تک بہت سے شاعری کا دعویٰ کرنے والے لوگوں کو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ جعلی الاٹمنٹوں اور راتوں رات امیر بن جانے کے نسخے ڈھونڈھنے والے معاشرے میں ناصر اُداس کیوں تھا ۔

ناصر نے اپنی اُداسی کو اپنا بھجن کہا اور اُس کی غزلوں میں کئی جگہ انسانی رشتے اور انسانی تعلقات تقدّس آمیز جذبۂ عبودیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں :

اپنی دُھن میں رہتا ہوں — میں بھی تیرے جیسا ہوں
او پچھلی رُت کے ساتھی — اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن — دکھ کے کنکر چنتا ہوں
مجھ سے آنکھ ملائے کون — میں تیرا آئینہ ہوں
میرا دیا جلائے کون — میں ترا خالی کمرہ ہوں
تیرے سوا مجھے پہنے کون — میں ترے تن کا کپڑا ہوں
تو جیون کی بھری گلی — میں جنگل کا رستہ ہوں
آتی رُت مجھے روئے گی — جاتی رُت کا جھونکا ہوں
اپنی لہر ہے اپنا روگ — دریا ہوں اور پیاسا ہوں

"پہلی بارش" کی غزلیں تو ایک دوسرے تفصیلی مطالعے کی متقاضی ہیں کیونکہ اس سلسلے کی غزلوں اور اس کے بعد کہی جانے والی غزلوں میں تلازمات کا ایک نیا منطقہ ظاہر ہوتا ہے ۔ ان غزلوں کی تصویروں میں ندیاں ، نو کے ، جھیلیں اور جزیرے اُبھرتے ہیں ۔ بلکہ کئی جگہ پانی میں بسنے والی آبادیاں بھی سامنے آتی ہیں ، ماہی گیروں اور کشتیاں چلانے والوں کے چہرے دکھائی دیتے ہیں ۔ اس نئے رُخ میں ناؤ اور ندی کے رشتے اور اسی طرح کے تلازمات جتنی کثرت سے آئے ہیں پہلے ناصر کی شاعری میں کبھی دکھائی نہیں دیے ۔ ظاہری طور پر تو اس تبدیلی کا سبب وہی ہے جو بعض احباب بتاتے ہیں ، یعنی سفرِ بنگال ، لیکن باطنی طور پر ان تجربوں نے ناصر کی شخصیت کے پورے نظام کو گرفت میں لے لیا ہے ۔

ناصر کا سفر شہروں کے اُجڑنے ، قافلوں کے لٹنے اور اُڑتی ہوئی خاک کے درمیان شروع ہوا تھا اور ساحلوں پہ گانے والوں اور کشتیاں چلانے والوں کے گم ہونے پر ختم ہوا ۔ ناصر کاظمی کے ذہن کو اُس کے اپنے تجربوں اور دلچسپیوں کے حوالے سے سمجھا جائے تو اُس کی شاعری کی ساخت

کو بھی ایک نئے طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ناصر کاظمی کا داستانوں اور حکایات سے ربط، مصور شاغال اور شاعر لورکا سے اُس کا وابستگی محسوس کرنا، ہندی شاعری اور دوہے کی روایت سے گہرا واسطہ، سور داس، میرا بائی اور کبیر کے سنگیت رس سے دلچسپی اور میر اور فراق سے اُس کی شیفتگی، یہ تمام وہ عناصر ہیں جو اُس کے ذاتی تجربوں میں حل ہو کر نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔

ابھی تک ناصر کاظمی کا نہ تو پورا کلام ہی چھپا ہے اور نہ ہی اُس کی نثری تحریریں، پھر بھی یہ اس بات کا جواز نہیں کہ ناصر کی شاعری کی مجموعی شکل دیکھنے کی بجائے اُسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے۔ ناصر کی شاعری سے علمی صداقتیں اور نظریاتی اُصول بھی بے شک نکالیے لیکن پہلے یہ بھی تو دیکھیے کہ ناصر کیا کہتا ہے۔ بہرحال ہمارے نقّاد تو اور بکھیڑوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ناصر کے رویّوں کے سمجھنے کے لیے کیوں نہ سرسوں کے پھول سے رجوع کیا جائے کہ جسے ناصر نے اپنا ہم عصر کہا تھا۔ ناصر کا یہ اصل ہم عصر ہمیں اب بھی اُس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔

* * *

[پاکستان ٹیلی ویژن کی طرف سے اس انٹرویو کا اہتمام ناصر کاظمی کی وفات سے کوئی تین ساڑھے تین ہفتے پہلے کیا گیا تھا ۔ انٹرویو کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ۔ ناصر سے رسمی انداز میں سوال کرنا میرے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا اور ناصر تو مذاق میں بھی رسمی گفتگو کا قائل نہیں تھا اس لیے انٹرویو کی ابتدا ہم دونوں ہی کے لیے ایک مشکل مرحلہ تھی ۔ مگر بیچ بیچ میں آنے والوں نے مداخلت کرکے اس مشکل مرحلے کو آسان بنا دیا ۔ یہ انٹرویو میو ہسپتال کے اس کمرے میں لیا گیا تھا جہاں ناصر صاحب ِ فراش تھا اور جہاں اس نے زندگی کے آخری سانس لیے ۔ بات ہونے لگی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مریض کو دیکھنے آ گئے ، ان کے جانے کے بعد بات پھر شروع ہوئی مگر تھوڑی ہی دیر میں دوسرے ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ، پھر تھوڑے وقفے سے نرس تھرما میٹر لیے آن پہنچیں ، اور پھر بھابی صاحبہ آ گئیں ۔ بس اسی عمل میں ٹیلی ویژن والوں کے بتائے ہوئے سارے ادب و آداب رفع دفع ہو گئے اور ناصر کا بات کرنے کا اپنا طریقہ بحال ہوگیا ۔

اس وقت مجھے یہ بالکل احساس نہیں تھا کہ ناصر کاظمی انٹرویو نہیں دے رہا ہے بلکہ اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہا ہے ۔ سامان سمیٹ کر اسے ہمارے سپرد کرنا تھا اور خود آگے جانا تھا ۔ جب گفتگو کرتے ہوئے اس نے شہر کے قہوہ خانوں ، درختوں اور چڑیوں کو میرے ہاتھ سلام کہلوایا تو بھی مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ درختوں اور چڑیوں سے بھری کائنات کو ناصر کا یہ آخری سلام ہے ۔ پتا نہیں خود ناصر کو بھی اس کا احساس تھا یا نہیں ۔ بہرحال انٹرویو کے بعد اس نے کئی بار مجھ سے پوچھا کہ انٹرویو کب نشر ہو رہا ہے ؟ اور ایک مرتبہ برہم ہو کر کہا کہ کیا ٹیلی ویژن والے میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں ؟ میں نے فوراً بات بنائی کہ اصل میں محرّم کے پروگراموں کی وجہ سے انہیں یہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا ، محرّم کے بعد انھوں نے اس پروگرام کے لیے کوئی تاریخ رکھی ہے ۔

محرّم کے ختم ہوتے ہی سچ سچ وہ بدقسمت تاریخ آ گئی ۔ ناصر کے تعزیتی پروگراموں کے ذیل میں یہ انٹرویو دکھایا گیا مگر ایک اقتباس کی حد تک ۔ اس کے بعد بھی مختلف پروگراموں میں اس انٹرویو سے اقتباسات پیش کیے گئے مگر ان اقتباسات سے پوری گفتگو کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ۔

یہ مکمل گفتگو جو ٹیلی ویژن کے ۵۵ منٹوں میں سمائی درج ذیل ہے ۔

انتظار حسین ۔]

* * *

آخری گفتگو

انتظار حسین : ناصر کاظمی

انتظار حسین : یہ البرٹ وکٹر ہسپتال کا کمرہ نمبر ۲۷ ہے - یہاں ناصر کاظمی زیرِ علاج ہیں - میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے اس شخص کو اس شہر میں ہمیشہ چلتے پھرتے دیکھا - درختوں کی چھاؤں میں ، دوپہریوں میں ، راتوں کو ، برسات کے اندھیاروں میں ، پت جھڑ کی دوپہروں میں ، کبھی کبھی آدھی آدھی راتوں کو - اور آج یہ شخص بستر پر لیٹا ہے - میں نے ان لمحوں کو غنیمت جانا اور سوچا کہ اس فرصت سے فائدہ اُٹھایا جائے اور ناصر کاظمی کے ساتھ مل جل کر ماضی میں ایک سفر کیا جائے - اس وقت میں ناصر کاظمی کے سرہانے کھڑا ہوں :

سرہانے میر کے آہستہ بولو

لیکن ناصر کاظمی جاگتا ہے اور میں ——

ناصر کاظمی ! سن ۱۹۴۷ع کے گویا آخری دن تھے جب سے میں نے تمھیں دیکھنا شروع کیا اور اب تک دیکھ رہا ہوں لیکن اس سے پہلے تم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے - اس کا مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں - میں نے تمھاری باتیں ضرور سنی ہیں ، شکاروں کی اور تمھارے گھوڑوں کی - کچھ بتاؤ اس زمانے کے متعلق -

ناصر کاظمی : انتظار حسین ، دراصل میں بظاہر جسمانی طور پر تو اب نہیں چلتا پھرتا کہ کچھ عرصے سے بیمار ہوں مگر میرا ذہن ، میری آنکھیں ، میری یادیں اسی طرح چلتی پھرتی

ہیں ، تمھارے ساتھ لاہور کی گلیوں میں درختوں میں اور اب تم نے جو ماضی کی بات چھیڑی ہے تو وہ تو ایک بہت طویل بات ہے ۔ اتنا ہے کہ جب پاکستان وجود میں آیا تو ایک بستی تھی انبالہ :

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

تو وہاں سے میں ہجرت کرکے آیا تھا ۔ وہاں میں نے جنم لیا ۔ والد میرے فوج میں تھے ۔ ایک چھوٹا سا معاشرہ تھا ۔ ہمارا گھر پرندوں ، یادوں ، بچوں ، پھولوں ، درختوں اور ننھی ننھی پیچ در پیچ گلیوں کا معاشرہ تھا ۔ اس میں سب لوگ ، امیر ، غریب بڑے سکھ اور امن سے رہتے تھے ۔ اور بڑے بڑے علما بھی رہتے تھے لیکن ایک عجیب بات تھی اس معاشرے میں کہ جو بظاہر غریب ننھے منے لوگ تھے ان کی عزت بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ بڑے لوگوں کی بلکہ شاید آن سے بھی زیادہ ۔ ایک وثیقہ نویس اتنی عزت رکھتا تھا اس معاشرے میں جتنی شاید ایک وزیر یا امیر کبیر نہیں رکھتا تھا ۔ پھر وہاں ایک سکول تھا چھوٹا سا ، مسلم ہائی سکول ، اس میں میں نے تعلیم پائی ۔ وہاں بڑے بڑے یادگار اساتذہ تھے ، ایسے استاد جو اب شاید ملیں گے نہیں ۔ والد میرے فوج میں تھے ، میں پشاور گیا ، نوشہرہ ، ڈگشئی ، شملہ ، ڈیرہ دون ، بہت سیر و سفر کی ان کے ساتھ ، اور بڑی آرزو تھی کہ فوج میں جاؤں ، گیا بھی پھر چھوڑ دی اور میرے بچپن میں جو مشاغل رہے ہیں وہ بھی یہی رہے ہیں ، گھڑ سواری ، شکار کھیلنا ، دیہات میں پھرنا ، دریاؤں کی سیر ، پہاڑوں کی سیر اور غالباً وہی ایک زمانہ تھا جہاں سے میرے ذہن نے فطرت سے محبت اور شاعری سے لگاؤ کے لیے نشو و نما پائی ۔ تو یہ تو بچپن تھا ۔ وہاں سے ہم نے دسویں پاس کی — لاہور کی خبریں سنا کرتے تھے کہ یہ بڑا شہر ہے ۔ پڑھنے کا

شوق بھی تھا تو یہاں پڑھنے کے لیے آ گیا ۔ اور اس پر شاید ایک شعر بھی کہا تھا :

شہرِ لاہور تیری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

پاکستان جب قیام میں آیا تو کچھ اپنے دوستوں ، عزیزوں پہ مشتمل چھوٹا سا ہمارا ایک قافلہ ـــ جب ہم نے واہگہ بارڈر کراس کیا تو میرے ابا نے پرچم سبز ہلالی دیکھا اور کہا ، ”بیٹا ! مبارک ہو ! تمھیں پاکستان مل گیا ۔“ تو میں نے ابا سے کہا تمھیں بھی مبارک ہو ۔ تو میرے ابا کہنے لگے کہ تمھیں اس لیے مبارک دے رہا ہوں کہ تم وارث ہو اس زمین کے تمھیں زیادہ رہنا ہے ۔ میں تو اب تھکا ہوا سورج ہوں ، دیوار تھام کر چل رہا ہوں ۔ اور اس کے بعد پاکستان میں جب ہم آئے تو جس طرح دفتروں میں نہ قلم تھا نہ دوات تھی نہ سٹیشنری ، بے سر و سامان ـــ ہم بھی بے سر و سامان تھے ۔ تمھیں تو یاد ہی ہے ۔ تم ان لوگوں میں ہو جن سے میری پہلے ملاقات ہوئی ۔ حسن عسکری ، منٹو اور جتنے بھی دوست تھے ـــ ندیم قاسمی صاحب ، قتیل شفائی ، فیض صاحب ، حفیظ ہوشیار پوری صاحب ، پھر ملے ، بازاروں میں دکانیں بند تھیں ، کسی مکان کا کوئی دروازہ کھلا ہے تو کھلا ہے ، کسی کا بند ہے ۔ کوئی کھڑکی کھلی ہوئی ہے ، کوئی پنکھا چل رہا ہے ۔ کہیں کوڑوں کے ڈھیر ہیں ۔ یہ اونچی اونچی فلک بوس جو عمارتیں تم مال پہ دیکھ رہے ہو آج کل ۔ یہ واپڈا ہاؤس ، یہ کچھ نہیں تھا ۔ بس کچھ درخت تھے ، ہاتھ ملا کے ناچتے تھے اور ایسا لگتا تھا رات بھر درخت چاندنی میں ناچتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ ہم پھرتے تھے ۔ وہ راتیں بری تھیں لیکن ایک بات اس میں تھی ، اس بے سر و سامانی

میں ایک جینے کی بڑی امنگ کہ ہم نئے ملک کے وارث ہیں اور پھر ایک بات عجیب ہے، کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ میں ان ننھے حقیر لوگوں میں سے ہوں جس نے قائدِ اعظم محمد علی جناح سے ایک مرتبہ ہاتھ ملایا اور وہ ہاتھ میں نے ابھی تک کسی سے نہیں ملایا۔ تو اب پاکستان میں آ کر میں نے یہ دیکھا کہ یہ ایک دارالاماں مجھے مل گیا ہے——ڈاکٹر عالمگیر صاحب اسلام و علیکم۔

ڈاکٹر صاحب : اسلام و علیکم۔

ناصر : تشریف لائیے۔

ڈاکٹر صاحب : کیا حال ہے آپ کا۔

ناصر : اب تو بہتر ہے آپ کی عنایت سے۔ رات کچھ ذرا تھوڑی سی گرانی ہوگئی تھی لیکن لگ رہا ہے مجھے اب کہ آپ کی توجہ اور آپ کی محبت سے —— اب میں زندہ رہوں گا ضرور ——

ڈاکٹر صاحب : انشا اللہ۔

ناصر : اور میں بہتر ہوں۔

ڈاکٹر صاحب : (دیکھتے ہوئے) سانس لیجیے۔

ناصر : ڈاکٹر صاحب سگریٹ میں پی سکتا ہوں کہ نہیں۔

ڈاکٹر صاحب : (تامل سے) ہاں —— تھوڑا ——

ناصر : دو چار سگریٹ پی سکتا ہوں ؟

ڈاکٹر صاحب : دو چار —— کوشش کریں کہ نہ پئیں لیکن اگر نہ رہا جا سکے تو ——

ناصر : کھانے میں آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں خوش خوراک ہوں۔

ڈاکٹر صاحب : آپ کھائیے۔ بے شک کھائیے۔

ناصر : کیا خاص چیز آپ کے خیال میں مجھے کھانی چاہیے ؟

ڈاکٹر صاحب : نہیں جو مرضی کھائیں لیکن پانی اور نمک ذرا کم۔ گوشت کھائیں تو اچھا ہے۔ مرغ کھائیں بے شک۔

ناصر : بڑی عنایت آپ کی۔ اسلام و علیکم——ہاں تو انتظار حسین

میں یہ کہہ رہا تھا کہ بچپن میرا، جس کا میں نے تھوڑا سا پس منظر دیا، پاکستان میں آ کر مجھے بہت یاد آتا رہا لیکن تمھیں پتا ہے کہ یاد جو ہے انسان کی وہ ہو بہ ہو آتی ہے۔ یاد انتخاب کرتی ہے۔ کچھ واقعات ایسے ہیں جو دوبارہ بار بار آ کر میرا راستہ روکتے ہیں اور حاضرِ بزم ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا جیسے:

بہت قریب سے آئی ہے دُور کی آواز

تو کچھ یادیں بچپن کی ننھی ننھی ایسی ہیں جو — جو مجھے شاعری — انتظار صاحب آپ کہہ رہے تھے —

انتظار : ہاں! ناصر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم نے مجھے اپنے شکار کے قصّے بہت سنائے ہیں۔ ایک مرتبہ شیر کے شکار کا بھی قصّہ سنایا تھا۔ پتا نہیں تم نے مارا بھی تھا یا نہیں اور تم نے اپنی گھڑ سواری کا ذکر بھی کیا تھا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں — اور تم نے قائدِ اعظم سے مصافے کا تذکرہ بھی کیا — تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس سارے قصّے میں سے، یہ شاعری کہاں سے نکل آئی۔ اس میں — وہ کون سے تجربات تھے؟ وہ کیا صورتِ حال پیدا ہوئی کہ تم یہ سارے کاروبار کرتے شاعر بن گئے۔

ناصر : بات یہ ہے کہ جس طرح عطر کی شیشی آپ کھولتے ہیں تو خوشبو آپ کو آتی ہے تو پھول اور باغ تو نظر نہیں آتے۔ تو شاعری میں میری یہ تمام واقعات براہِ راست تو آپ کو نظر نہیں آئیں گے، البتہ یہ ہے کہ وہ جو یادیں ہیں، جو زمانہ تھا ہمارا غلامی کا، اور جس میں ہم جینے کے لیے کوشش کر رہے تھے، ان کی تگ و دو کو میری شاعری کے آہنگ میں، رنگوں میں، لفظوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ آئیے ڈاکٹر مسعود صاحب تشریف لائیے۔

ڈاکٹر صاحب : اسلام و علیکم۔ کیا حال ہیں آپ کے۔

ناصر : بس اچھے - رات کچھ ذرا تھوڑا سا مجھے نفخ اور درد رہا -
ڈاکٹر صاحب : اچھا -
ناصر : ویسے میں پہلے سے بہتر ہوں -
ڈاکٹر صاحب : الٹی ولٹی تو نہیں آئی -
ناصر : ایک مرتبہ ہوئی -
ڈاکٹر صاحب : اس کے بعد سارا دن نہیں -
ناصر : جی نہیں اس کے بعد نہیں -
ڈاکٹر صاحب : پیٹ میں ہوا کا کیا حال ہے -
ناصر : وہ بس رات تھی لیکن اب نہیں ہے -
ڈاکٹر صاحب : اب انجکشن ایک رہ گیا آپ کا -
ناصر : ایک رہ گیا - کل last drip ہے - اور اس کے بعد تو آپ نے بتایا تھا کہ وہ course پھر بعد میں repeat کریں گے -
ڈاکٹر صاحب : ٹھیک ہے - کل وہ ہو جائے گا -
ناصر : اچھا جی -
ڈاکٹر صاحب : اور اس کے بعد آپ تین ہفتے rest کریں -
ناصر : یہیں میں کروں گا rest -
ڈاکٹر صاحب : یہیں کریں گے آپ -
ناصر : دوسری دوائیں کھاتا رہوں -
ڈاکٹر صاحب : ہاں -

(نرس تھرما میٹر لگاتی ہے)

ناصر : کتنا ہے ؟
نرس : normal ہے -
ناصر : Thank you -

(ڈاکٹر اور نرس چلے جاتے ہیں)

انتظار : ہاں تو ناصر کاظمی ، وہ بیچ میں ڈاکٹر لوگ آ گئے اور بات بیچ ہی میں رہ گئی - تو میں یہ پوچھ رہا تھا کہ یہ شیر کے شکار سے نکل کر تم یہ شاعری کی طرف کیسے

چل پڑے -

ناصر : اصل میں شکار کی بات تو بیچ میں ایک شغل کی تھی - میرے سارے ہی شغل ایسے تھے جن کا تعلق تخلیق سے اور فنونِ لطیفہ سے ہے ، موسیقی ، شاعری ، شکار ، شطرنج ، پرندوں سے محبت ، درختوں سے محبت ، یہ سب جو ہے - معلوم ہوتا ہے کہ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا - شاعری اصل میں شروع ؔمیں نے اس لیے کی کہ یوں لگتا تھا مجھے کہ جو جو خوب صورت چیزیں ؔمیں فطرت میں دیکھتا ہوں وہ میرے بس میں نہیں آتیں ، میری گرفت میں نہیں آتیں اور نکل جاتی ہیں اور چلی جاتی ہیں - کچھ لمحے ، کچھ وقت جو مر جاتا ہے وہ زندہ دوبارہ نہیں ہو سکتا - میں سمجھتا ہوں کہ شاعری میں زندہ ہو سکتا ہے - اس لیے شاعری شروع کی - طبیعت موزوں تھی - گھر کا ماحول بھی شعر و شاعری کا تھا - گھر میں ہمارے میر انیس پڑھا جاتا تھا ، نانا میرے موسیقی کا شوق رکھتے تھے ، اور میر نظیر حسین ناشاد ، میر نیرنگ ، یہ ہمارے —— شہر میں بھی اچھی فضا تھی - کتابیں بھی گھر میں تھیں ، بچپن میں ہم نے شیخ سعدی پڑھا ، فردوسی پڑھا - یہ سب چیزیں پڑھائی جاتی تھیں ہمیں بچپن میں ، قرآنِ حکیم ، پورا آہنگ ، پورا لحن ، جو تھا وہ شعر کی طرف تھا - پھر ایک اور بات ہے جو مجھے سب سے اہم نظر آتی ہے - جب میں نے پہلا شعر کہا ، مجھے یاد نہیں ، مگر یوں لگتا ہے یہ شعر میرا پہلا شعر تھا :

قبول ہے جنھیں غم بھی تیری خوشی کے لیے
وہ جی رہے ہیں حقیقت میں زندگی کے لیے

تو مجھے یوں لگا ، اتنی خوشی ہوئی کہ شاید اس سے پہلے مجھے کبھی کسی چیز کی خوشی نہیں ہوئی - اگر مجھے شعر کے علاوہ اتنی خوشی کسی اور کام میں ہوتی تو میں

شاعری نہ کرتا ۔ تو دراصل آج بھی اگر مجھے کوئی ایسی خوشی مل جائے جو شعر کا بدل ہو تو میں شاعری چھوڑ دوں لیکن شاعری سے زیادہ مجھے خوشی نہیں ملتی ۔ اور تم جانتے ہو ، تم خود تخلیقی آدمی ہو ، کہ تخلیقی آدمی ایک سطر اچھی لکھ کر ، ایک جملہ بول کر ، ایک شعر لکھ کر جتنی خوشی حاصل کر سکتا ہے شاید کسی اور کام میں نہیں ۔ تو پھر شاعری میں میں نے ایک جادو اور دیکھا ۔ پرانے اساتذہ کا جب کلام پڑھتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ زمانے اور صدیاں ، میرے ساتھ ہمکلام ہیں بلکہ میں ان صدیوں میں پہنچ گیا ہوں ۔ یہ جادو کیا ہے ۔ گویا شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتی ہے ۔ وہ وقت جو مر گیا جسے کوئی بھی زندہ نہیں کر سکتا ، شاعر زندہ کر سکتا ہے ۔ اور اسی لیے شاید کہا تھا مولانا نے کہ :

شاعری جزو ایست از پیغمبری

تو غالباً اسی لیے شاعری شروع کی اور اب تک اس میں بس زور آزمائی کر رہے ہیں ۔ تک بندی کر رہے ہیں ، کبھی بات بن جاتی ہے کبھی نہیں بنتی ۔ اب یوں لگتا ہے کہ شعر کی تھوڑی سمجھ آئی ہے ۔ کچھ لکھنا آیا ہے ۔ تو اب آپ جو کہہ رہے تھے ——

انتظار : ہاں ناصر کاظمی میں ایک بات اور کہہ رہا تھا کہ تم نے اپنے گھر کی فضا کا ذکر کیا ہے ، لیکن تمہارے گھر کے باہر بھی ایک ادبی فضا موجود تھی ۔ وہ فضا بالکل مختلف تھی ۔ اس میں تو غزل بالکل معیوب اور معتوب صنفِ سخن بن چکی تھی ۔ وہ نئی نسل کا زمانہ تھا ۔ اس فضا میں تم غزل کی روش پر کیوں چلے ، کیسے چلے ۔

ناصر : اصل میں غزل کی روش پر تو میں نہیں چل نکلا ۔ مجھے غزل ، قطعہ ، رباعی ، آزاد نظم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں رہا ۔ مجھے تو شاعری سے سروکار ہے ۔ تمہیں

پتا ہے کہ شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں۔ شاعری تو ایک نقطۂ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا۔ چیزوں کو دیکھنے کا، ان کو ایک خاص موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے — تو غزل تو اتفاقیہ ایک صنف مجھے پسند تھی چونکہ میرا ایک پس منظر تھا اس میں میں نے زیادہ تر غزل کی شاعری پڑھی، پھر یوں دیکھیے کہ اردو کا بہترین سرمایہ تو غزل میں ہی ہے، تو جس زمانے میں میں نے شعر کہنا شروع کیے، اسلامیہ کالج لاہور میں میں تھا۔ یہاں فیض احمد فیض، راشد اور میرا جی کا طوطی بول رہا تھا اور اس کے بعد دوسری نسل تھی، یوسف ظفر اور ان کے ساتھی۔ غزل واقعی مشاعرے میں پڑھنا بہت مشکل تھا۔ لیکن یہ ہے کہ میں ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ میرے ساتھ حمید نسیم، حفیظ ہوشیار پوری تھے، ان کو بھی بڑے ادب سے منا جاتا تھا۔ تو ان دو تین شاعروں کے علاوہ غزل کا چراغ ویسے بھی نہیں چلتا تھا۔ لیکن دراصل میں نے غور کیا کہ غزل کے خلاف لوگ نہیں تھے۔ بلکہ غزل میں cliché کی پرانی ڈگر جو تھی اس کے خلاف تھے، وہ کہتے تھے کہ میاں نئی بات کرو۔ تو اگر غزل میں نئی بات کہی جا سکے اور غزل کا احوال، تمھیں پتا ہے کہ دلی شہر کا سا ہے۔ یہ بار بار اجڑتی ہے اور بار بار بستی ہے۔ کئی بار غزل اجڑی لیکن کئی بار یہ زندہ ہوئی اور اس کا یہی امتیاز ہے کہ غزل میں شاعری اچھی ہوئی ہے، شاید نظم کا اس آسانی سے چراغ نہیں جلا۔ خود فیض نظم لکھتے ہیں لیکن غور سے دیکھیے ان کی ساری کی ساری شاعری غزل ہے۔ تغزل ہی تغزل تو ہے جس کی وجہ سے فیض شاعر ہے۔ تو یہ ہے۔ غزل اس لیے میں نے اختیار کی۔ اور جہاں تک جدید شاعری کا تعلق ہے اس میں — کچھ خیالات اس زمانے میں نئے آئے تھے تو ان کا غزل برابر

ساتھ دیتی رہی ہے - اور میرا خیال ہے جو غزلیں میں نے کہی ہیں میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے اپنی دانست میں یہ سوچ کر کہیں کہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں - اور اس میں میرے عصر کی روح ہو - جی فرمائیے ——

انتظار : ناصر کاظمی تم نے نئے تقاضوں کی بات کی ہے مگر آج کل تو ادیب سے سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بھئی تمہارا commitment کیا ہے - تو اس سوال کا جواب اگر تم دینا چاہو تو دے سکتے ہو -

ناصر : بات یہ ہے کہ یوں تو سوال پہلے بھی ہوتا رہا ہے ، آج کل تم صحیح کہہ رہے ہو کہ یہ خاص طور پر کیا جاتا ہے مگر commitment میں نے اس طرح بعض بیانات کی صورت میں تو شاید بہت کم کیا ہو لیکن میرے کلام میں آپ کو —— میرا تو خیال ہے کہ میں نے جو لفظ لکھا ہے وہ commitment سمجھ کر لکھا ہے - پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ کو آپ دیکھیں اور میرے کلام کو دیکھیں تو ضرور اس میں وہ چیزیں دھڑکتی ہوئی نظر آئیں گی -

انتظار : تم نے اس وقت بہت سے شاعروں کے نام گنوائے لیکن مجھے کچھ اور شاعر یاد آ رہے ہیں جن کا تم ذکر کیا کرتے تھے - بلھے شاہ ، کبیر ، سور داس تو ——

ناصر : میرا بائی -

انتظار : میرا بائی - تو ان شاعروں سے تمہارا کیا رشتہ ہے ؟ حالانکہ تم اپنے قارئین کو صرف میر کے نام سے اپنا رشتہ بتاتے رہے ہو -

ناصر : اصل میں ، شاعر جو ، جتنے بھی دنیا میں موجود ہیں ، سرمایہ ہیں سب کا - کسی جغرافیائی حدود میں بند نہیں - مجھے تو سپین کا شاعر لورکا (Lorca) بھی پسند ہے -

Garcia Lorca - اور تمھیں پتا ہے کہ میں اسے ایسے پڑھتا ہوں جیسے میر - میر کا ذکر اس لیے کرتا تھا کہ ایک خاص فضا میں ، پاکستان بننے کے بعد میر کے کلام کی گویا ایک relevance سی ہو گئی تھی - مگر میں نے ان شاعروں کو ، اس لیے پڑھا کہ وہ مجھے اتنے پسند تھے کہ یوں لگتا تھا کہ یہ کلام یا تو میرا ہے یا مجھے لکھنا چاہیے تھا - تو اس لیے اس میں کیا قباحت تمھیں نظر آئی - میں تو انھیں اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں - خواہ وہ میرا بائی ہوں ، خواہ وہ لورکا ہو ، خواہ وہ کالی داس ہو خواہ وہ رامبو (Rimbaud) ہو - تو یہ تو سارے میرے ہم عصر گزرے ہیں -

انتظار : مگر تم نے مجھ سے تو یہ کہا تھا کہ سرسوں کا پھول بس میرا ہم عصر ہے -

ناصر : اصل میں سرسوں کا پھول تو ایک —— آپ کو پتا ہے سرسوں کا پھول کس چیز کا نام ہے - وہ محض بظاہر تو آپ کو ایک پتی سی زرد سی نظر آتی ہے - وہ تو ایک موسم ، ایک رنگ ایک تہذیب کا نام ہے - تو وہ پوری تہذیب میری ہم عصر تھی - تو سرسوں کے پھول کے ہم عصر کا مطلب ہے کہ سرسوں کے ساتھ جتنی تہذیب اور رنگ اور میلے اور اس کے ساتھ ہرنوں کا چوکڑئیں بھرنا اور وہ رنگ کے میلے ہونا اور وہ زرد زرد موسم اور آسمان و زمین میں قوسِ قزح کا اترنا - اس سارا —— میرے پورے عصر کی روح تھی اس میں - تو میں نے ایک چیز لے لی :

خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارہ

سرسوں کے پھول سے دکھانا مقصود تھا اس پوری دھرتی کو -

انتظار : ٹھیک ہے - اب تم نے میلوں کا ٹھیلوں کا اور اس قسم کی چیزوں کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ ناصر کاظمی تم نے گل

پھول کی کافی بات کی ہے - تو اب میرا یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ تمھاری شاعری میں شہر کیا کر رہا ہے ، جیسے کہیں تم شہر طرب کہتے ہو اور کبھی یہ سوال اٹھاتے ہو کہ :

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصر : شہر اصل میں ایک محض آبادی کا نام تو نہیں ہے یا جس میں بسیں وسیں چلتی ہیں محض - شہر تو ایک پورا معاشرہ ہے - ایک پتّی بھی میرے لیے شہر ہے ، ایک درخت بھی شہر ہے ، پھول بھی شہر ہے - اور دل سے بڑا کیا شہر ہوگا - تمھیں معلوم ہے غالب نے کہا تھا :

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو

اصل شہر تو دل ہے - باقی شہر جو باہر آباد ہیں وہ اس کی چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں - گویا جتنے شہر ہیں باہر اس شہرِ عظیم جسے ہم دل کہتے ہیں اُسی کی گلیاں ہیں -

انتظار : تو اس سے مجھے تمھاری ایک بات یاد آئی - اسلامیہ کالج میں تمھارے ساتھ ایک شام منائی گئی تھی - تو تم نے وہاں یہ کہا تھا کہ درخت تو آدمی کے اندر ہوتا ہے -

ناصر : جی ہاں -

انتظار : تو اس کے باوجود تم باہر کے درختوں کا ذکر بھی بہت کرتے ہو -

ناصر : بات یہ ہے کہ باہر کی چیزیں جب اچھی لگتی ہیں جب آدمی کے اندر کچھ زندگی ہو - دریا اس شخص کو بہتا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہو :

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی

تو یہ دریا کا احساس تو اندر ٹھاٹیں مارتا ہے ، دریا مزاج - اُسی طرح سے درخت ہے - آپ کو پتا ہے کہ یہیں سے تو

دنیا شروع ہوئی - سو یہ درخت تو growth کا symbol ہے اور میری شاعری کا جزوِ اعظم ہے - درخت ، شہر ، چاند ، پھول ، فطرت romantic چیزیں نہیں ہیں

انتظار حسین دراصل یہ ایک بڑی مہذب تہذیب ، جسے صدیوں میں انسان نے خون دے دے کر پالا ہے ، اس کے استعارے ، اس کی زندہ علامتیں ہیں - آپ اندازہ کریں جس شہر میں درخت ہوں ، پرندے ہوں ، کبوتر ہوں ، چڑیاں ہوں ، آسمان کھلے ہوں وہ کوئی romance نہیں ، romantic کون کہتا ہے اسے - اس کے پیچھے تصور کرو اس معاشرے کا کہ کیسے لوگ بستے ہوں گے جنھوں نے وہ پھول لگائے ہیں ، وہ درخت بنائے ہیں -

انتظار : اب تم نے شہر کا جو یہ نقشہ کھینچا ہے تو مجھے وہ دن یاد آئے ہیں جب اسی شہر میں تم راتوں کو دوستوں کے ساتھ گلی گلی اور کوچہ کوچہ گھوما کرتے تھے - ایک ہوٹل سے نکلے دوسرے ہوٹل میں ، پھر یہاں کچھ بڑے ہوٹل تھے ان میں جا کر بیٹھتے تھے ، وہاں سے نکلتے تھے تو بھاٹی دروازے اور لوہاری دروازے تک جا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتے تھے اور ایک بات مجھے یوں یاد آتی ہے کہ جوں جوں رات گزرتی تھی تو تمھاری آواز میں ایک عجیب چمک اور گرمی پیدا ہوتی چلی جاتی لیکن جب صبح ہونے لگتی تھی اور تڑکا ہونے لگتا تھا اور چڑیاں بولتی تھیں تو تمھاری آواز میں بہت اداسی آ جاتی تھی اور جو اداس شعر تمھیں یاد ہوتے تھے تم اس وقت سنایا کرتے تھے - یہ رات اور صبح کا جو فرق تھا تمھارے یہاں یہ کیا تھا ؟

ناصر : یہ طلوع و غروب ، اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے - اس کی وجہ ، رات اندھیری رات نہیں یا وہ جسے ہمارے جدید شاعر ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں - رات تخلیق کی علامت ہے - دنیا کی ہر چیز رات میں

تخلیق ہوتی ہے - پھولوں میں رس پڑتا ہے رات کو ، سمندروں میں تموج ہوتا ہے رات کو ، خوشبوئیں رات کو جنم لیتی ہیں - حتیٰ کہ ، فجر تک ، فرشتے رات کو آترتے ہیں - سب سے بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوئی - ایک یہ بات - دوسری بات یہ ہے کہ تم نے جو ان راتوں کا ذکر کیا تو اب بھی راتیں جاگتی ہیں لیکن شہر سوتا ہے اور میں اب تک بیمار ہوں اور :

تھا جن کو دردِ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

الحمد للہ کہ میں زندہ ہوں اور بیمار ہوں مرا نہیں اور اس لیے تمھیں یہ لگتا ہے کہ میں نے راتوں کو پھرنا چھوڑ دیا - راتوں کو میں جاگتا ضرور ہوں -

انتظار : ویسے ناصر کاظمی تمھارے ساتھ کے کچھ بیمار تو زندہ ہوں گے ہی -

ناصر : ہاں ایک تو بیمار تم بھی کھڑے ہو لیکن تم نے بھی سوٹ پہن لیا ہے - البتہ ایک مشتاق ہے ، وہ بھی بہت نئے نئے سوٹ بدل کے آنے لگا ہے مگر ایک زمانہ تھا اس نے ہی کہا تھا نا کہ :

کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا

تو بات یہ ہے کہ بیمار ابھی بہت زندہ ہیں میرے ساتھی -

انتظار : تو میرے خیال میں تمھاری شاعری میں کچھ ان راتوں کا ، کچھ ان بیماروں کی —— گفتگوؤں کا ، کچھ سارے جادو کا جو اس زمانے کا ہے ، شاید دخل ہے ، اور مجھے یوں احساس ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جو تھا تمھاری تخلیقی زندگی میں بھی بہترین تھا اور شاید اس ملک کی تخلیقی زندگی میں بھی بہترین تھا -

ناصر : شاید ایسا ہو - گزرا ہوا زمانہ ایک تو اچھا بھی لگتا ہے لیکن اس وقت تک یہی مجھے اندازہ ہے کہ وہ اگر بہترین نہیں

تھا تو وہ ایسا زمانہ ضرور تھا کہ ویسا نظر نہیں اب آتا۔ اور اس زمانے میں ، میں اور میرے ساتھی جو کچھ لکھتے تھے یوں لگتا تھا کہ اس کا ایک impact ہوتا تھا۔ اور ادھر میں نے غزل کہی ، ادھر وہ چھپی اور اگلی صبح کو کافی ہاؤس میں دوست احباب اس کو اس طرح سناتے تھے جیسے یہ ان کی غزل ہے۔ اور بھی دوستوں کا یہ حال تھا۔ منٹو افسانہ لکھتے تھے۔ عسکری مضمون لکھتے تھے۔ تم افسانہ لکھتے تھے۔ فیض کی نظم کا ایک ایک مصرعہ چلتا تھا ، مصرعے ، دوڑتے ہوئے آدمیوں کی طرح تھے ، ایک فضا تھی۔

انتظار : اس زمانے میں تم نے کچھ رسالے وسالے بھی نکالے تھے۔

ناصر : ہاں ایک پرچہ اس زمانے میں --- نوکریاں وغیرہ غربت میں ڈھونڈیں ، پہلے ملتی نہیں تھیں پھر ایک ملی تو پھر ایک پرچہ نکالا تھا اوراقِ نو۔

انتظار : ہوں۔

ناصر : وہ یہاں پڑا ہے۔ ذرا اس کا ٹائیٹل دیکھو اور اندازہ کرو۔ میں اور ریاض قادر --- یہی یہی جلد والا --- میں اور ریاض قادر دو سر پھرے تھے۔ ریاض قارد ، سر عبدالقادر اور عبدالرحمٰن چغتائی ، مصورِ مشرق ، اس کے سرپرست تھے۔ اور یہ دیکھو ذرا تمہیں اس کا ٹائیٹل ہی دکھا دیتا ہوں۔

انتظار : واہ۔

ناصر : یہ دیکھو۔

انتظار : واہ وا۔

ناصر : یہ سب سے پہلے ڈبل پرنٹنگ شاہد خاکسار نے کی۔ اور پرچوں میں بعد میں۔ یہ اندر دیکھیے قائدِ اعظم کی Portrait اور یہ اس کے Patron تھے ، سر عبدالقادر مرحوم۔ ہیں جی۔ تو یہ ایک پرچہ نکالا تھا۔ حال ہی میں حمید اللہ خاں مرحوم --- یہ انہوں نے شائع کیا۔ یہ دوسرا پرچہ تھا اس کا رنگ بدل گیا۔ زوبی نے بنایا تھا ٹائیٹل۔ اس میں اور بھی مصور شامل تھے۔ یہ پرچہ شاعروں ، ادیبوں ، افسانہ نگاروں

اور سر پھروں کا پرچہ تھا ۔ اس کے بعد ـــ

انتظار : ''ہمایوں'' میں بھی تو تم ایڈیٹر رہے ۔

ناصر : ہمایوں کے بارے میں علامہ اقبال کا بڑا مشہور فقرہ ہے کہ جب ہمایوں کا اجراء ہوا تو انھوں نے میاں بشیر احمد مرحوم کو لکھا کہ اس ہمایوں کو کوئی شیر شاہ زک نہیں پہنچا سکتا ۔ اور ایسا ہوا ہے ۔ عجیب بات ہے انتظار کہ ـــ

انتظار : کہ زمانے کے شیر شاہ نے اسے زک پہنچائی ۔

ناصر : زک پہنچائی اور یہ میرے ہاتھوں بند ہوا ـــ (انتظار حسین ہنستے ہیں) مجھے اس کی بہت تکلیف بھی ہے ۔ اور ایک بات یہ ہے کہ یہ پہلا سالنامہ ہے ہمایوں کا ، اس پر یہ دیکھیے ، مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی اچنگ ہے جو مجھے انھوں نے دی تھی ۔ یہ میں نے پہلی بار "ہمایوں" میں تبدیلی کی تھی ۔

انتظار : واہ ۔

ناصر : اس رسالے کا میں پانچ برس مدیر رہا ۔ بلکہ نائب مدیر ۔ مجھے میاں بشیر احمد یاد آ گئے ۔ تو اب اس کے بعد ایک اور پرچہ ـــ جب ''ہمایوں'' بند ہوا تو پہلے سوچا کوئی کاروبار کریں پھر ایک اور پرچہ نکالا ۔ ان دنوں ۱۹۵۷ع کا سن تھا ، تمھیں یاد ہے کہ تمھارے ساتھ مل کر ، تم میرے ساتھ مدیر تھے ، یہ پرچہ "خیال ، آزادی نمبر" نکالا جس کا ٹائیٹل یہ حنیف رامے نے بنایا ہے ۔ یہ میرے پرانے بیماروں میں سے تھا مگر اب بہت صحت مند ہو گیا ہے ۔ اور یہ دیکھیے "خیال'' ، تمھارا نام بھی اس میں ہے اور اتفاق ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ بعد میں اس کو کتابی صورت میں بھی مرتب کیا گیا ۔ یہ دیکھیے لکھنئو کا مورچہ ، کیسی کیسی تصویریں ہم نے جمع کی تھیں ، سارا سارا دن ہم پھرتے تھے ۔ دیکھو اس میں دلی کا مورچہ تمھیں دکھاؤں ۔ یہ دیکھیے

— یہ دیکھیے — معاف کیجئے دیر ہو گئی تصویریں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ، یہ پرچہ اور یہ ہیں میری کتابیں ، کتابیں کیا دراصل یہ کتاب ہے "برگِ نے" یہ میری غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے اور آخری بھی اب تک ۔ یہ سن ۵۳ء میں شائع ہوا اس میں ستر کے قریب غزلیں ہیں ۔ اور تمھیں پتا ہے کہ جب یہ کتاب چھپی تو میرے لیے میری زندگی میں سب سے نیا واقعہ تھا ۔ اور اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اور تیسرے ایڈیشن کے میں اب تک انتظار میں ہوں — ناشر کہتے ہیں کہ شائع کریں گے ۔ اور اس کے بعد یہ — دو — anthologies ہیں ۔ بہترین شاعری — سن ۶۳ء کی اور ۶۹ء کی ۔ یہ حلقہء اربابِ ذوق کی طرف سے میں نے مرتب کی تھیں ۔ یہ دونوں کتابیں اور اس میں تمام اردو کے شعرا کا سال کا بہترین کلام انتخاب کیا تھا ۔ اور اس کے بعد یہ کتاب ہے جس کو مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے دیکھ کر ۔ یہ اس کتاب کا نام ہے — فراق گورکھپوری کی غزلوں کا انتخاب ہے — "غزل" — تو یہ انتخاب حال ہی میں شائع ہوا ہے ۔ اس کے علاوہ میری تین چار کتابیں ہیں جو مرتّب کر رہا ہوں اور انشا اللہ اب شائع ہوں گی ۔ ایک منٹ معذرت — آئیے — بیگم صاحبہ آپ بڑی دیر سے آئیں ۔

بیگم ناصر : دیر ہو گئی — کالج میں کام تھا ۔ صبح سے طبیعت کیسی ہے آپ کی ۔

ناصر : طبیعت تو بہتر ہے ۔ اب انھوں نے آ دبوچا ہے —

بیگم ناصر : اسلام و علیکم ۔

انتظار : و علیکم اسلام ۔

ناصر : اور آپ جانتی ہیں کہ انتظار حسین صاحب آئے ہیں ۔ یہ افسانہ نگار ٹھہرے اور ان سے لڑائی ٹھہری ۔ شاعر

مختصر گو اور افسانہ نگار ––– تو ––– تھوڑا سا پانی عنایت کر دیجئے ۔ ہاں انتظار صاحب ۔

انتظار : اچھا مجھے بھابی کے آنے پر یاد آیا کہ جب تمھاری شادی ہوئی تھی تو وہ تمھاری یعنی تخلیقی زندگی کا جوبن تھا ۔ تو کسی شاعر کی بھری جوانی میں یعنی تخلیق کی بھری جوانی میں شادی ہو جائے تو مداحوں میں ایک بڑا ہی تہلکہ مچتا ہے ، اکثر مداح اور ان کے ہم عصر یہ کہتے تھے کہ اب ناصر کاظمی شاعری نہیں کر سکے گا ––– تو –––

ناصر : وہ بات بتاؤں ––– اگر اجازت ہو ––– دراصل اس پر مجھے کوئی تشویش اس لیے نہیں تھی کہ جب شادی ہوئی اور یہ دلہن بن کر میرے گھر آئیں تو میں نے انھیں کہا کہ ایک بات ہے اگر آپ برا نہ مانیں تو عرض کروں وہ یہ کہ میری ایک اور بیوی بھی ہے ، تو ایک دفعہ تو جیسے ان کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی لیکن پھر میں نے انھیں اپنی یہ کتاب "برگِ نے" دی ––– میں نے کہا وہ یہ میری بیوی ہے تو بارے ان کو اطمینان ہوا ۔

انتظار : تو شاعری کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی ۔ یہ "برگِ نے" جو تمھاری شائع ہوئی ہے اسی زمانے میں شائع ہوئی شاید شادی کے –––

ناصر : تو اس میں سے کوئی غزل ، اگر تم اچھے شعر–––

––– لائیے تمھیں کچھ شعر سنا دیتا ہوں ۔ یہ غزل ۔ اس میں تھوڑی سی خطابت ہے ۔ مگر یہ ہے کہ بعض وجوہ سے مجھے پسند ہے کہ طلوع و غروب کے مناظر ہیں ۔ حیرت و عبرت کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے ، کس طرح چیزیں ڈوبتی ہیں ابھرتی ہیں ۔ کس طرح صبح شامیں ہوتی ہیں ۔ اور کچھ قرآن کریم کے پڑھنے والوں کے لیے بھی ––– یہ کچھ دو چار شعر میں

عرض کر دیتا ہوں ---

ساز ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سن

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سن

یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شور درا غور سے سن

انتظار : یہ شعر پھر سنا دیجئے۔کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام

ناصر : کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سن

کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال
شب گزیدوں کی دعا غور سے سن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سن

برگِ آوارہ بھی اک مطرب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سن

عشق کو حسن سے خالی نہ سمجھ
نالۂ اہلِ وفا غور سے سن

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سن

تو یہ غزل ایک تھی --- اس کے بعد میں نے غزلیں کہی ہیں ۔

انتظار : ’’برگِ نے‘‘ کے بعد تم کیا کرتے رہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ناصر کاظمی خاموش ہو گیا ۔

ناصر : ہاں "برگِ نے" کے بعد دراصل میری شاعری کا جو ایک لحاظ سے بہتر اور زیادہ تخلیقی دور ہے میرے خیال میں وہ --- اتنا خوبصورت دور تو نہیں لیکن وہ ''برگِ نے'' کے بعد ہی شروع ہوا ۔ میں "برگِ نے" کے بعد لکھتا رہا اور لکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر چھپتا کم رہا ہوں ۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ بھئی ''برگِ نے'' کے بعد میں خاموش ہوں تو وہ خود اصل میں لا پتا ہیں ۔ کبھی کبھی آتے اور کہتے ہیں ناصر بھائی ادھر کوئی غزل بنائی تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ ادھر آپ کو کیا پتا کہ میں نے کیا کیا ہے ۔ دراصل ادھر آدھر کے چکر میں وہ رہتے ہیں ، میں نے تو اتنا کچھ لکھا ہے بھائی ، ایک پوری چودہ سو لائنوں کی ''سُر کی چھایا'' تمھیں پتا ہی ہے ۔ وہ ''سویرا'' میں چھپی تھی ۔ اور اس کے بعد نظمیں کئی لکھی ہیں اور ڈیڑھ سو غزلیں ہیں ۔ پچیس غزلوں کا مجموعہ ہے ''پہلی بارش'' اور بے شمار فیچر لکھے ہیں جن میں کچھ ایسے ہیں جو محض فیچر ہی نہیں ہیں ۔ مضامین لکھے ہیں ، ترجمے کیے ہیں ۔ کتابیں edit کی ہیں ۔ دراصل میرا تو کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں ۔ دراصل میری زندگی کا تو مقصد ہی بھائی یہ ہے کہ فرصت کماؤں اور اس فرصت میں شعر لکھوں ۔ چھپا کم ہوں اور وہ کہ دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا ---

اس کے بعد لاہور میں نیشنل وار فنڈ کا ایک مشاعرہ تھا ۔ اس میں یگانہ چنگیزی تھے ۔ اس مشاعرے میں ، میں یگانہ کو اب بھی بہت بڑا شاعر مانتا ہوں ، لیکن کمال یہ ہے کہ یگانہ چنگیزی ہوٹ ہوئے اور مجھے دوبارہ سنا ۔ یہ تقدیر دیکھیے ، بہرحال ۔ پھر پاکستان بنا ۔ تو ایک مرتبہ پاکستان بننے کے بعد دو چار میں نے مشاعرے پڑھے --- گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ تھا ، اس میں میں نے ترنم سے چار غزلیں پڑھیں ، اور اس میں حضرتِ جوش بھی تھے ۔

حضرت حفیظ جالندھری تھے ، احسان دانش تھے ، ندیم قاسمی تھے ، قتیل شفائی تھے تو ان کے سائے میں میری غزلیں بھی چلیں اور مجھے یہ احساس ہوا کہ میں مشاعرے میں بھی چل سکتا ہوں ۔ مشاعرے میں تمھیں پتا ہے شعر پڑھنا بڑا مشکل ہے ۔ بہر حال ، اس کے بعد پھر یکایک یہ ہوا کہ مجھے یہ خیال آیا کہ مجھے ترنم کی وجہ سے شاید داد ملتی ہے ۔ اور وہ آخری مشاعرہ تھا اور اس کے بعد میں نے ترنم سے کبھی غزل نہیں پڑھی اور اب تو یہ عالم ہے کہ چاہوں بھی تو نہیں پڑھ سکتا ۔ بہرحال اس کی وجوہات بھی تھیں کہ میں چاہتا تھا کہ جو تحت اللفظ میں rhythm کی وساطت سے لفظوں کا آہنگ اور نشست اور مصرعوں میں جو zone of silence بناتا ہوں اور چکر چلاتا ہوں وہ ترنم میں ادا نہیں ہو سکتے ۔ ترنم تو کھا لیتا ہے شعر کی تمام خوبیوں کو ۔ تو تحت اللفظ ہی ترنم ہے ۔ اس کے بعد پھر آہستہ آہستہ ندیم قاسمی صاحب ، قتیل صاحب ، خاص طور پر میرے مشاعرے کے ہمسفر ہیں ۔ مجھے لے جاتے ہیں اور پاکستان کا شاید ہی کوئی مشاعرہ ہو جہاں میں نہ بلایا گیا ہوں ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ داد مجھ سے زیادہ اور شاعروں کو ملتی ہے ۔ کسی کسی مشاعرے میں داد ملی ۔ مثلاً ایک مشاعرہ تھا ۔ اس میں میں بڑا کانپتا کانپتا گیا ، حیدرآباد میں مرحوم نیاز کمشنر تھے وہاں پر یہ مشاعرہ کرایا انھوں نے ۔ کوئی دس ہزار کے قریب لوگ ہوں گے ۔ میں جب مائیک پر پہنچا ، اختر حسین صدارت کر رہے تھے ، تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ، ہوٹنگ کا ، میں بڑا پریشان اور اتنا مجھے رنج کہ میں نے جیب سے کچھ پیسے نکالے ، میں نے کہا حضور میں نے پیسے لے لیے ہیں اب کہیے تو چلا جاتا ہوں ۔ تو اس میں سے چار پانچ لڑکے اٹھ کے آئے کہنے لگے صاحب

آواز نہیں آ رہی ۔ مائیک خراب ہے ۔ خیر میری تسلی ہوئی کہ بھئی مجھے ہوٹ نہیں کیا —— اور میں نے غزل پڑھی —— وہ —— ع

چاند کس شہر میں اترا ہوگا

تو یہ شعر میرا اگلے روز حیدرآباد میں ——

انتظار : پورا شعر سنا دیجیے ذرا ۔

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

اگلے روز میں پان کی دکان پر پان جو کھانے لگا ، حیدرآباد —— تو کہنے لگے صاحب یہ شعر آپ ہی کا ہے ، تو میں نے کہا جی ہاں ۔ ایک صاحب پیچھے تھے وہاں ، اس پان کی دکان پر ، کہنے لگے اساں نہیں ۔ اچھا صاحب ۔ میں نے کہا کہ میں نے خود وہاں پڑھا ہے یہ شعر ، رات لوگوں نے مجھے دیکھا ہے ۔ کہنے لگے کہ شعر بہرحال آپ کا نہیں ہے تو میں نے کہا کہ بہت اچھا ——

انتظار : ناصر کاظمی ، قطع کلام ہوتا ہے ۔ تم نے اپنے بہت بڑے بڑے ہم عصروں کا نام لیا ہے جن کے نام سن کر میں دہلا جا رہا ہوں لیکن تم نے اصل اور سچے ہم عصر کا نام اب لیا ہے ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کچھ پنواڑی تھے ۔ اس شہر میں کچھ تانگے والے تھے ان سے تمھارا بڑا یارانہ اور ہم عصری کا تعلق تھا ۔ ان کا تم ذکر ہی نہیں کر رہے ۔

ناصر : صاحب : تعلق تو میرا اب بھی ان سے ہے ۔ ابھی ابھی

پرسوں مجھے ہسپتال میں ٹیکسی والوں کا ایک وفد ملنے آیا کہنے لگا صاحب اخبار میں پڑھا کہ آپ کو طبی امداد کی کچھ کمی ہے ، کچھ دقّت ہے - تو یہ لیجئے ہم کچھ اکھٹا کرکے لائے ہیں - میں نے کہا کہ نہیں - تو اسی طرح سے تمھیں یاد ہے کہ مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی - ایک تانگے والا مرحوم میرٹھی مر گیا بابا - اس سے میری دوستی کی بنیاد ہی یہی تھی کہ ایک دن بارش ہو رہی تھی - اس سے کہا کہ تانگہ بھئی لے چلو گے گھر میرے کرشن نگر - اس نے کہا کہ نہیں صاحب - میں نے کہا بھئی چلو - کہنے لگا کہ میں نے بڑی بڑی سواریوں کو انکار کیا ہے اس بارش میں ، اس برکھا میں کون جائے گا - تو میں نے کہا بھائی میں شعر کہتا ہوں - کہنے لگا کوئی شعر سناؤ - تو جب میں نے یہ شعر سنایا کہ ——

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

تو وہ بڈھا باہر بارش میں بھیگتا بھیگتا تانگے سے اچھل پڑا - کہنے لگا - ابے لونڈے تیرا یہ شعر ہے - آ بیٹھ تانگے میں اور ساری عمر مفت لے جاؤں گا اور تا دمِ آخر وہ مجھے لے جاتا رہا -

انتظار : ویسے ناصر کاظمی تمھیں اس حادثے کا پتا ہے - پتا نہیں کہ وہ جو تانگے والے جن کے ساتھ تمھارا یارانہ تھا ، اور بعض تانگوں میں ّمیں تمھارے ساتھ بیٹھتا رہا ہوں ، انھوں نے ٹیکسیاں چلانی شروع کر دی ہیں - پرسوں ہی میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا تھا تو ٹیکسی والے نے مجھے مڑ کر دیکھا اور کہا کہ بھئی ناصر صاحب کیسے ہیں - تو میں نے اسے تمھارا حال سنایا - جو جالندھری تھا ، تمھیں یاد ہوگا، وہ تانگہ چھوڑ کے ٹیکسی چلاتا ہے -

ناصر : تو اسی طرح سے ہے - ادیبوں میں سے بھی تو اب بہت سے ادیب کاروں میں چلتے نظر آتے ہیں - جو پتلے تھے موٹے ہو گئے - بعض ادیبوں نے ہوٹل میں آنا چھوڑ دیا ہے اور انھوں نے میرے دیکھتے دیکھتے گھروں میں ڈرائینگ روم بنائے ہیں - اب باقاعدہ ان کے پاس ٹی سیٹ بھی ہیں - بھائی ہمارا تو سڑکوں پہ ہوٹل تھا - آپ کو پتا ہے درختوں کی چھاوں ہمارے لیے محفل ہوا کرتی تھی، آؤ گھاس پہ سبھا جمائیں - میرا ہی مصرع ہے -

آج تو شہر کی روش روش پر
پتوں کا میلا سا لگا ہے

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے

تو وہ ڈرائینگ روم میں چلے گئے ہیں سارے ادیب - کالونئیں بن گئیں، بستئیں بس گئیں -

انتظار : ایک بات پوچھتا ہوں تم سے، کہ کیا ادیب کو، شاعر کو محض شاعر ہونا چاہیئے یا اس کے سوا بھی کچھ ہونا چاہیے -

ناصر : شاعر تو محض شاعر ہی ہوتا ہے مگر اس کا مطلب نہیں کہ وہ بیکار ہوتا ہے - حضور شاعر باقاعدہ آدمی ہوتا ہے، انسان ہوتا ہے - شریف آدمی ہوتا ہے - شادی کرتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے - جب لکھتا ہے تو ہنگامہ ہو جاتا ہے شہر میں - آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ جب وہ یہ کہتا ہے کہ وہ محض شاعر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کلرک نہیں ہوتا، کلرک شاعر ہو سکتا ہے - شاعر کلرک نہیں ہوتا - کچھ مراعات چاہتا ہے وہ کچھ facilities، بالکل اسی طرح سے کہ جیسے کہ میرے بعض دوست، تمھارے بہت سے دوست، ہم سب کے ساتھی، ہمارے زمانے میں کچھ لکھنا و کہنا شروع کیا تھا انھوں نے،

دو دو مضمون تین تین مضمون لکھ کے اپنا امتحان دے کر کرسیوں پر بیٹھ گئے - اب ان سے پوچھتا ہوں لکھیے - کہ صاحب یہ ملازمت میں دیکھیے نا فرصت نہیں ملتی - ناصر بھائی یہ ہو گیا وہ ہو گیا تو اگر میں یہ کہہ دوں کہ بھائی صاحب ادھر میں اپنی غزلوں وزلوں میں مصروف ہوں تمھارے دفتر وفتر میں نہیں آیا جاتا تو پھر میں کیوں نہیں حق بجانب ہوں .Poetry is a full time job آپ بتائیے کبھی میر نے کوئی اور کام کیا شاعری کے علاوہ یا غالب نے کوئی اور کام کیا - علامہ اقبال نے کوئی اور کام کیا - D. H. Lawrence نے کبھی کوئی کام کیا - Lorca نے کبھی کوئی اور کام کیا . کالی داس نے سوائے اس کے کہ بھجن گاتا ! میرا بائی نے ——

انتظار : ڈرامہ لکھتا تھا -

ناصر : ڈرامہ لکھتا تھا - بلھے شاہ نے کچھ کیا - ہیں - سلطان باہو نے کبھی کچھ کیا - وارث شاہ نے کبھی کچھ کیا -

انتظار : یہ تم کس زمانے کا ذکر کر رہے ہو -

ناصر : سنو سنو ، شیخ سعدی کے زمانے میں شیخ سعدی نے پتا ہے پندرہ یا بیس یا پچاس بادشاہ دیکھے - کسی کمبخت بادشاہ کا نام تمھیں معلوم نہیں ہے - سوائے شیخ سعدی کے -

انتظار : مگر تمھیں ایک بات کا احساس ہونا چاہیے - کہ یہ زمانے جو تھے جس کا تم ذکر کر رہے ہو ، وہ تو گزر گئے - اب تو ادیب کو ادیب کے سوا بھی بہت کچھ ہونا پڑتا ہے -

ناصر : بھائی ادیب ، ادیب کے سوا میں نے تو عرض کیا کہ ہوتا ہے - میری ہی مثال لو - میں نے جن حالات میں شادی کی تمھیں پتا ہے ، چھ براتی تھے میرے - کون ایسا

جگر رکھتا ہے جو اتنی ہمت کرے ۔ ورنہ تو لوگ اسی چکر میں رہتے ہیں کہ دھوم سے شادی کرو۔ normally میں نے ایک مسلمان اور شریف آدمی کی طرح شادی کی ۔ جو اس وقت جیب میں تھا یا دوستوں سے اکھٹا کر کے شادی کی ، بچے پیدا کیے ، پالا انھیں اور بہت کم دوستوں کو تکلیف دی ، بہت کم لوگ ہیں جو یہ کہیں گے کہ جن کے پاس چل کر گیا ہوں اور چل کے جانے میں عیب بھی نہیں ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جی رہا ہوں ۔ لڑ رہا ہوں ۔ اور آدمیوں کی طرح جیتا ہوں ۔

انتظار : تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس زمانے میں جب کہ ادیب اور شاعر ، ادیب و شاعر کے سوا بھی کچھ کام کرتے ہیں اور اس سارے گھپلے میں ، اس سارے confusion میں تم شاعر کو کیسے پہچانتے ہو ۔

ناصر : ادیب ، شاعر کو ایک بات سے پہچانتا ہوں ۔ بلکہ کئی باتیں ہیں ۔ لیکن چلیے ایک نشانی بتا دوں تمھیں ۔ آپ سورج کو کیسے پہچانتے ہیں ۔ ایک طرف سے نکلتا ہے ایک طرف سے ڈوبتا ہے ۔ یہی نا ۔ ذرا مجھے کوئی آدمی زیادہ کامیاب نظر آئے تو میں اس کے ادب ودب پر شک کرنے لگ جاتا ہوں ۔ ذرا زیادہ ہی کامیاب زندگی میں ۔ اور آپ یہ دیکھیے کہ بعض لوگ مختلف شعبوں میں پڑے ہیں اور وہ شاعر ہیں ۔ تخلیقی لوگ ہیں ۔ ننھے ننھے مزدور ۔ میں نے تو دفتروں میں بعض کلرکوں کو دیکھا ہے اور بعض ریڈیو میں ، بعض ادھر ادھر اور اداروں میں ۔ وہ بڑے تخلیقی لوگ ہیں ۔ وہ بڑے خاموش خادم ہیں ۔ اس سے بڑا کون شاعر ہے ۔ انجن ڈرائیور سے بڑا جو کتنے ہزار اور کتنے سو مسافروں کو لاہور سے کراچی لے جاتا ہے اور کراچی سے واپس لاتا ہے ۔ مجھے یہ آدمی بہت پسند ہے اور ایک کانٹے والا ۔ پھاٹک بند کرنے والا ۔ یہ بھی شاعر ہیں میری برادری کے لوگ ۔ اپنا اپنا role ہے ۔

آپ کو پتا ہے اگر وہ پھاٹک کھول دے ، گاڑی جب آ رہی ہو تو کیا قیامت آئے - بس شاعر کا بھی یہی کام ہے کہ کس وقت پھاٹک بند کرنا ہے ، کس وقت کھولنا ہے - جب گاڑی گزرتی ہے اس وقت -

انتظار : لیکن ایسے شاعر بھی تو تم نے دیکھے ہوں گے کہ جب پھاٹک کو بند رہنا چاہیے اس وقت کھول دیتے ہیں اور جب کھولنا چاہیے بند کر دیتے ہیں -

ناصر : کیونکہ وہ صرف اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے - شاعر جو ہے وہ ساری انسانیت کے بارے میں سوچتا ہے - وہ سمجھتا ہے کہ جب اوروں کا بھلا ہوگا تو اس کا اپنا بھلا خود بخود ہوگا -

انتظار : اب دیکھو تم نے شاعر کی تعریف بھی کر دی ہے اور اتنے شاعروں کا تم نے تذکرہ بھی کیا ہے جس میں سے کچھ تمھارے جونیئر ہیں ، کچھ سینئر ہیں - اب یہ بتاؤ کہ ان میں تمھیں شاعر کی حیثیت سے سچا اور کھرا کون نظر آتا ہے ، کون پسند ہے ؟

ناصر : بات یہ ہے کہ شاعر تو شاعر ہی ہوتا ہے - جو شاعر ہیں وہ تو مجھے پسند ہیں اور جو شاعر نہیں ہیں ان کے حق میں دعا کرتا ہوں - بس یہ ہے - اب کتنی فہرست تمھیں گنواؤں - میرے ساتھیوں میں تقریباً سارے ہی اچھے شاعر ہیں - اس لیے کہ ان سے میری دوستی کیوں ہوتی پھر - میری تو بنیاد ہی ان سے ملاقات کی یہی ہے - اب انیس بیس کا فرق تو رہتا ہے - اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آج تو ایک ادمی نے اچھا لکھا ہے مگر کل نہ لکھ سکا - آپ نے دس غزلیں بہت اچھی لکھی ہیں تو اب معاشرہ دس غزلوں کی کتنے دن تعریف کرے گا - وہ تو کہے گا گیارہویں غزل لاؤ - تو اگر گیارہویں اچھی نہیں تو آپ کا معاملہ گول ہوتا چلا جاتا ہے - بات یہ ہے - تو اس طرح بعض حادثے بعض شاعروں پر گزرے ہیں جس کی وجہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اچھے نہیں رہے - شاعر تو شاعر ہوتا ہے اور برا لکھتا ہی نہیں -

انتظار : تو یہ جو اچھے لکھنے کا جو مسئلہ ہے یہ بھی ایک بڑا یعنی مجرد سوال ہے نا۔ تم اچھے لکھنے کو کیسے پہچانتے ہو۔

ناصر : اچھے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا لکھے۔ ایک شاعر کے شعر کو سن کے کچھ دیر آپ کو کسی اور کا شعر یاد نہ آئے۔ بس۔ یہی اچھا لکھنا ہے۔ اگر میرا شعر سن کے تمھیں غالب کا شعر یاد آئے تو جیسے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے چیونٹی کا حال ہوتا ہے وہی حال ہوگا میرا۔ بس اس سے بڑا کیا ہے۔

انتظار : اچھا تم نے گیارہویں غزل کی بات کی تو میرا جی چاہتا ہے کہ تم اپنی گیارہویں غزل سنا دو۔

ناصر : ہاں ایک غزل ہے جو میں نے ان دنوں میں کہی ہے۔ وہ سن لیجئے۔ اور چشمہ لگانا پڑے گا اس کی معذرت چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ دور تو میں اب دیکھ سکتا ہوں، قریب کی چیزیں ذرا کم نظر آتی ہیں کیونکہ قریب کے جو لوگ ہیں وہ دھندلا گئے ہیں۔ اس لیے اب کم آنے لگے ہیں نظر۔ تو میں نے چشمہ لگا لیا ہے۔

انتظار : لیکن میرے لیے تمھارا عینک لگانا جو ہے یہ نیا واقعہ ہے۔

ناصر : چلیے صاحب ابھی اور واقعے دیکھو گے۔

دیکھیے جا رنگِ زمانہ ابھی دیکھا کیا ہے

اچھا بھائی غزل سنو۔ یہ میری تازہ ترین غزل ہے:

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

انتظار : واہ! واہ! واہ! واہ

ناصر : **وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں**
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

انتظار : واہ! واہ! واہ!

ناصر : **میں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر**
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے

وہ دل میں کھبنے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے کیا ہوئے

انتظار : واہ ! واہ ! واہ !

ناصر : عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

انتظار : واہ !

ناصر : اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

انتظار : واہ

ناصر : یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

انتظار : واہ ! واہ ! یہ شعر پھر پڑھیے -

ناصر : یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اُٹھانے والے کیا ہوئے

بس یہ ایک غزل تھی تازہ -

انتظار : واہ ! واہ ! واہ ! واہ ! - یہ غزل سن کر مجھے تمہارے کچھ پرانے شعر یاد آ گئے ہیں - ویسے تو تم نے اپنی غزلوں میں شہرِ طرب اور شہرِ گل کا بہت ذکر کیا ہے لیکن کچھ اشعار ان میں ایسے بھی ہیں جنھیں سن کر مجھے ہمیشہ ڈر سا لگتا تھا ، مثلاً ایک شعر مجھے یاد آتا ہے کہ ——

خیر ہو شہرِ شبنم و گل کی
کوئی پھرتا ہے آس پاس اُداس

تو جب بھی میں یہ شعر سنتا تھا تو میرا کچھ دل دھڑکتا سا تھا کہ پتا نہیں یہ کیا ہونے والا ہے جس کے متعلق ناصر کاظمی بات کر رہا ہے - تو شہرِ شبنم و گل کے ساتھ شاید یہ واردات گزر ہی گئی ہے جس کا تم نے اس میں تذکرہ کیا ہے - بہت اچھی غزل - واہ -

ناصر : بہرحال، میں تو بہت شکر گزار ہوں ۔ اتنی دیر تو مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ میں بیمار ہوں اور ایسا لگتا ہے کہ صحت اور خون میں تازگی یکایک پتا نہیں کہاں سے لوٹ آئی اور ایک بیمار شاعر کی تیمارداری بھائی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ اس سے تازہ کلام سنا جائے ۔ روز آیا کرو روز سنا کرو ۔

انتظار : ویسے ناصر کاظمی تمھارے بھی کچھ بیمار ہیں ان میں سے ایک میں بھی ہوں ۔

ناصر : اچھا بھئی ۔

انتظار : تو تمھاری باتیں اور شعر سن کر ہماری بھی تیمارداری ہو گئی ۔

ناصر : اللہ ایسے بیماروں کو زندہ رکھے جن سے صحت کے سرچشمے پھوٹتے ہیں ۔

انتظار : تو خدا تمھیں صحت نصیب کرے ۔ جب صحت تمھیں ہو جائے گی تو کسی چائے خانے میں بیٹھیں گے ۔

ناصر : انشا اللہ ۔

انتظار : باتیں کریں گے ۔ شعر سنیں گے ۔

ناصر : میرا سلام کہیے لاہور شہر کے نواح سے، دوستوں سے، قہوہ خانوں سے، درختوں سے، چڑیوں سے، پرندوں سے ۔

انتظار : درخت اور چڑیاں جن سے میری ملاقات ہے وہ تمھیں بہت یاد کرتے ہیں ۔

ناصر : میں بھی انھیں یاد کرتا ہوں ۔

انتظار : اچھا تو اب ——

ناصر : شکریہ ۔

انتظار : چلتے ہیں ۔

ناصر : اچھا بھئی ۔

انتظار : تو یارو، ناصر کاظمی سے ہم نے اتنی باتیں کیں اور شعر بھی سنے ۔ بہت اچھا یہ وقت گزرا —— تو اب چلتے ہیں، خدا حافظ ۔

* * *

